مسٹر بھٹو کے خلاف قتل کا مقدمہ

گرفتاری ضمانت پر رہائی اور دوبارہ گرفتاری سے فیصلہ محفوظ ہونے تک —— تاریخ وار مکمل رُوداد

قاتل کی سزا کیا ہوگی؟

پاکستان میں رائج برطانوی قانون کی نظر میں قاتل کی سزا پر مکمل تبصرہ اور اسلامی قانون کا تقابل

بیگم نصرت بھٹو کے بیان میں کیا تھا؟

مسٹر بھٹو کے مقدمہ قتل کے بارے میں بیگم نصرت بھٹو کے متنازعہ اخباری بیان پر حبیب الوہاب الخیری کی لاہور ہائیکورٹ میں مکمل درخواست کا متن

کراچی میں تاریخ کی سب سے بڑی آگ

صحافت کی خصوصی رپورٹ

عظیم باکسر —— محمد علی

پہلی فتح سے آخری شکست تک مکمل کہانی

ایڈیٹر
ضیا شاہد

قیمت
دو روپے

انکی خوشبو نفس نفس میں ہے

صبح کا آغاز

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم روزانہ صبح کی نماز کے بعد صحابہ سے دریافت کرتے کہ کوئی بیمار تو نہیں — اگر جواب اثبات میں ملتا تو فرماتے "سب سے پہلے اس کی تیمارداری کرنی چاہیئے"۔ اگر کوئی بیمار نہ ہوتا تو جنازے کے بارے میں دریافت کرتے کہ شہر میں کسی کا انتقال تو نہیں ہوگیا — اگر جنازہ موجود ہوتا یا اس کی خبر ملتی تو سب سے پہلے اس کی طرف توجہ فرماتے اور خود وہاں تشریف لے جاتے۔ اگر ایسا کوئی کام نہ ہوتا تو صحابہ کے ساتھ تشریف فرما ہو جاتے اور اس وقت تک مجلس میں رہتے جب تک سورج نہ نکل آتا۔ اٹھنے سے پیشتر مل کر دعا کرتے اور پھر سب اصحاب کو اپنے اپنے کام پر جانے کی نصیحت فرماتے اور دعا دیتے، راستے میں کوئی ضرورتمند ملتا تو پہلے اس کی ضرورت کی طرف متوجہ ہوتے اور جب تک اس کا کام پورا نہ ہو جاتا وہ جگہ نہ چھوڑتے۔

تاجدارِ دو عالم — سادگی کی انتہا

آپ کو کہیں جانا ہوتا تو جو سواری میسر ہوتی اس کو استعمال کرتے۔ کبھی گھوڑے پر سوار ہوتے تو کبھی خچر پر، کئی مرتبہ گدھا بھی استعمال کیا — کوئی سواری نہ ہوتی تو پیدل ہی چل کھڑے ہوتے، راستے میں کوئی بچہ ملتا تو لازماً اسے پیار کرتے — کنیز، غلام یا غریب ملتا تو اس سے خود حال دریافت کرتے۔ خود زمین پر بیٹھتے اور زمین پر ہی کھاتے پیتے۔ کوئی جو کی روٹی بھی پیش کرتا تو خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے تناول فرماتے، گھر میں اصرار کر کے غلام یا ملازم کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے، کپڑے پھٹ جاتے تو خود ہی سی لیتے، پاپوش ٹوٹ جاتا تو خود گانٹھنے بیٹھ جاتے، حاضرین میں سے کوئی یہ کام کرنے کی پیشکش کرتا تو وہ شکریہ ادا کرتے، مگر کبھی اپنا کام دوسروں کو کرنے نہ دیتے، یہاں تک کہ پانی بھی پینا ہوتا تو بھی خود ہی پیتے۔ باہر سے گھر میں آتے تو خادم کے ساتھ سبزی کاٹتے، کھانا پکاتے یا صفائی میں مدد فرماتے۔

تاجدارِ دو عالم کو شاید ایسا کرنے کی ضرورت نہ تھی — کہ ان کے ایک اشارے پر اپنا لہو نچھاور کرنے والے موجود تھے، لیکن یہ سب کچھ کر کے وہ اپنی امت پر یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ فخر و مباہات سے گریز کس قدر ضروری ہے اور انسان کو ان برائیوں سے بچنا چاہیے۔

دولت کی تقسیم کا حکم

ایک مرتبہ ایک شخص رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور ان سے کچھ مانگا۔ آپ نے جواب دیا "اس وقت میرے پاس تمہیں دینے کو کچھ بھی نہیں، تم میرے پاس بیٹھو، اگر میرے پاس کوئی چیز آئی تو تمہاری ضرورت پوری ہو جائے گی"۔

حضرت عمرؓ بھی مجلس میں موجود تھے۔ انہوں نے فرمایا: "یارسول اللہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ اپنی طاقت سے بڑھ کر میں تمہیں تکلیف نہیں دیتا — جواب میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خاموشی اختیار کی، جس کا مطلب تھا کہ اگرچہ یہ گنجائش موجود ہے لیکن وہ اس سے بھی زیادہ کرنا چاہتے ہیں، آخر کار ایک شخص ہدیہ کے طور پر کچھ کھجوریں لے کر آیا، آپ نے وہ سب کھجوریں اس ضرورت مند کو دیدیں۔

حضورؐ کے پاس ہدیہ، غنیمت، زکوٰۃ یا خراج وغیرہ کا کوئی سامان آتا تو نہ اس پر رات گزرتی نہ دوپہر یعنی صبح سویرے آتا تو دوپہر سے پہلے اسے تقسیم فرما دیتے اور دن ڈھلے آتا تو شام سے پہلے پہلے مستحق لوگوں میں بانٹ دیتے۔ کہتے ہیں، درہم و دینار نے کبھی آپکے پاس رات بسر نہیں کی۔

ایک مرتبہ کوئی خاتون آپ کے لئے ایک چادر لائیں۔ آپ نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا "سچ تو یہ ہے کہ اس وقت مجھے چادر کی بہت ضرورت تھی۔

تھوڑی دیر بعد ایک اور شخص آیا اور اس نے چادر کی تعریف کرتے ہوئے آپ سے درخواست کی کہ اسے عطا کر دی جائے۔ آپ نے فوراً چادر اس کے حوالے کر دی۔ صحابہؓ میں سے بعض نے اسے بتانے کی کوشش کی لیکن آپ نے اشارے سے منع فرمایا اور کہا "اپنے ساتھیوں کو شرمندہ نہیں کرنا چاہیے"۔

مسلمانوں کا خاندان

حضورؐ سراپا رحمت و شفقت تھے اور یہی خصوصیات پورے مسلمان معاشرے میں دیکھنا چاہتے تھے۔ اگر کوئی شخص تین روز تک مجلس میں دکھائی نہ دیتا تو اس کے بارے میں دریافت کرتے۔ اگر کوئی شخص کسی عذر کی وجہ سے غیر حاضر ہوتا تو اس کے لیے دعا فرماتے۔ کوئی بیمار ہوتا تو عیادت کے لئے جاتے۔ کسی کے دل میں خفگی ہوتی، یا کسی ساتھی سے ناراضگی ہوتی تو بلا کر ناراضگی دور فرما دیتے۔ جو ملنے آتا اس سے ملاقات کرتے، کسی کو یہ شکایت نہ ہوتی کہ آپ نے لیے وقت نہیں دیا، گفتگو اتنی توجہ اور محبت سے فرماتے کہ سننے والا مسحور رہ جاتا، سلام کرنے میں ہمیشہ پہل کرتے اور فرماتے "کسی مسلمان کا اپنے مسلمان بھائی سے تین روز تک بول چال بند کرنا گناہ ہے"۔ مصافحہ کرتے وقت کبھی اپنا ہاتھ پہلے نہ چھڑاتے۔ جس شخص کے گھر جاتے، اس کے بچوں کے سر پہ ہاتھ پھیرتے اور ان سے شفقت کا اظہار کرتے ہوئے دعا دیتے، ملاقات کے لیے آنے والے کو اپنے پاس بٹھاتے اور کوئی اجنبی یا باہر سے آنے والا ہوتا تو اس کے لئے اپنا کپڑا بچھاتے، کبھی دوسرے کے حق میں بددعا نہ فرماتے اور کہتے "مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان کو تکلیف نہ پہنچے۔

خدمت گار سے سلوک

حضرت انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ میں نے دس برس تک حضورؐ اقدس کی خدمت کی۔ اس پورے عرصے میں آپ نے ایک بار بھی مجھے اُف تک نہیں کہا۔ نہ کبھی یہ کہا کہ تو نے ایسا کیوں کیا اور نہ پوچھا کہ ایسا کیوں نہیں کیا۔ دس برس کے عرصہ میں ایک بار بھی مجھے ملامت نہیں کی، نہ آپ کے گھر والوں نے کبھی ناگواری کا اظہار کیا۔

حضرت انسؓ نے یہ ایک واقعہ بیان کیا کہ ایک مرتبہ مجھے حضورؐ اقدس نے کسی ضروری کام سے بھیجا۔ میں نو عمر تھا، گھر سے نکلا تو بچوں کو کھیلتے دیکھا اور خود بھی ان کے ساتھ کھیلنے لگا۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ حضورؐ چلے آ رہے ہیں، میں ڈر گیا، انہوں نے مجھے گدی سے پکڑا، میں سمجھا ناراض ہیں، مڑ کر دیکھا تو ہنس رہے تھے۔ فرمایا "اے انس تو وہاں نہیں گیا جہاں میں نے تجھے بھیجا تھا"۔ میں نے عرض کی "یارسول اللہ ابھی جا رہا ہوں"۔ اس پر آپ نے میرے سر پہ ہولے سے تھپکی دی اور میں بھاگ کھڑا ہوا۔

حضرت انس ہی سے روایت ہے کہ ایک بار کسی ملازم نے سنگین غلطی کا ارتکاب کیا۔ آپ نے فرمایا "جی چاہتا ہے کہ تجھے سزا دوں لیکن خدا کے خوف سے ڈرتا ہوں کہ کہیں سزا تیری غلطی سے بڑھ نہ جائے اور قیامت میں اس کا بدلہ دینا پڑے"۔ اتنا کہا اور خاموش ہو گئے۔

سچائی کی انتہا —

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بدترین مخالف بھی اس بات کے قائل تھے کہ آپ مجسم سچائی ہیں۔ یہاں تک ابوجہل نے خود آپ سے یہ کہا کہ میں مانتا ہوں کہ آپ نے آج تک جھوٹ نہیں بولا، لیکن جو دعوت تم دیتے ہو، اس کو میرا دل نہیں مانتا۔

آخری حملہ شروع ہو چکا

گذشتہ ہفتے لاہور میں سابق وزیرِ اعظم مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے مقدمہ قتل کا فیصلہ کرنے والے ہائی کورٹ کے تین ججوں کی رہائش گاہ پر جو فائرنگ ہوئی وہ پاکستان کی تاریخ میں ایک نیا موڑ ہے اور اس بد قسمت قوم کے لیے مصیبتوں کے ایک نئے باب کا آغاز ــــ یہ واقعہ ایسا نہیں کہ چند ایک اخبار ایک دوسرے کی مخالفت میں خبروں کو توڑ مروڑ کر مطلوبہ رنگ آمیزی کر دیں یا بعض سیاستدان یا سیاسی جماعتیں اس کی ذمہ داری ایک دوسرے پر ڈال کر خود کو بری الذمہ سمجھ لیں۔ یہ واقعہ ایسا بھی نہیں کہ کچھ سرکاری افسر اس کے بارے میں انٹ شنٹ بیان دے کر اور شہری انتظامیہ کے ارکان، سپاہیوں کی ٹکڑیوں کو گنتی کے چند گھروں کے دروازوں پر متعین کر کے مطمئن ہو جائیں ــــ اس حادثے میں جو نقصان ہوا' اس کا ازالہ وکلا کی بعض تنظیموں کی قراردادوں یا ہمارے جیسے چند بزعم خود لکھاریوں کی طرف سے مذمت کی چند سطریں گھسیٹ دینے سے نہیں ہوتا ــــ کیونکہ جو تھوڑی بہت فہم و بصیرت خدا نے ہمیں دی ہے' اس کی روشنی میں صاف طور پر دیکھا جا سکتا ہے کہ پاکستان کے دشمنوں کی طرف سے خواہ وہ اس ملک کی سرزمین پر رہتے ہوں، اسی کا کھاتے ہوں، اسی سے پہننے کو ملتا ہو، لیکن نمک حراموں کی ایک موثر تعداد نے جنہیں کسی بھی وقت بیرونی دشمنوں کی تائید اور حمایت بھی مل سکتی ہے (یا شاید مل چکی ہو) اس مملکت پر اپنے آخری حملے کا آغاز کر دیا ہے اور یہ حملہ اس قدر ہوشیاری سے کیا گیا ہے کہ خود پاکستانیوں کی اکثریت بھی جن پر حملہ ہوا، اس کی سنگینی سے ناواقف نظر آتی ہے یا شاید روز افزوں معاشی مسائل میں گھرے ہونے اور کم و بیش ہر سیاسی جماعت یا جماعتوں کے گروہ سے شدید مایوس اور بدظن ہونے کے باعث ان کی توجہ اس طرف مبذول نہیں ہو سکی۔

اس سے پہلے کہ ہم اس بظاہر معمولی واقعے کو بغور دیکھیں اور اس کی پشت پر کام کرنے والے عناصر اور قوتوں کا جائزہ لیں، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کسی بھی آزاد معاشرے میں عدلیہ کی ضرورت سمجھنے کی کوشش کریں ــــــــــ

خاص طور پر اس حالت میں کہ یہ بد قسمت معاشرہ خود کو مسلمان بھی کہتا ہو اور اسلام کی ان عظیم روایات سے بھی آگاہ ہو جن میں عدلیہ اس حد تک آزاد ہوتی ہے کہ قاضیِ عدالت کے سامنے حاکمِ وقت کا جاہ و جلال اور عزّ و اختیار ہیچ نظر آتا ہے۔

یہ کوئی علمی بحث نہیں، سیدھا سادا سوال ہے، ہر پڑھا لکھا شخص جانتا ہے کہ ماضی میں مختلف پاکستانی حکمرانوں نے انصاف کو کچلنے اور ذاتی اقتدار کے لیے عوام کے حقوق غصب کرنے کی ہر ممکن کوشش کی، کالے قوانین بنائے، بنیادی حقوق معطل کیے، نچلی سطح پر جہاں عام آدمی کا واسطہ ہوتا ہے، انتظامیہ اور عدلیہ کو مشترک رکھا، تاکہ وہی جو حاکم کا حکم لوگوں تک پہنچائے، لوگوں کی طرف سے انصاف کی اپیلیں بھی سنے ــ تاکہ اوّل تو کسی کو اس "کوتوالِ شہر" سے اس کی دی ہوئی سزا کے خلاف اپیل کرنے کی جرات نہ ہو اور اگر کوئی ایسی جسارت کر بیٹھے تو اس کو جواب میں جو کچھ بھی ملے، انصاف نہ مل سکے، کہ خود کو قصور وار ٹھہرانے والے انتظامی افسر انسانوں میں تو ملنا تو مشکل ہیں، ہاں فرشتے ان کی جگہ ہوں تو یہ توقع رکھی جا سکتی ہے۔

یہ سب کچھ تھا، لیکن چھوٹی عدالتوں کے برعکس جہاں انگریز کے دور ہی سے انتظامیہ اور عدلیہ ایک دوسرے میں گڈمڈ کر دی گئی تھیں تاکہ نوآبادیات کے شہریوں کو حاکم وقت کے خلاف زبان کھولنے یا فریاد کرنے کا موقع نہ ملے، ہائیکورٹ اور سپریم کورٹ ایسے ادارے تھے جہاں سے ہر دور میں ان پابندیوں کے باوجود جو حاکموں نے ان پر عائد کیں اور عوام پر بھی، کسی نہ کسی حد تک انصاف یہاں سے مل جاتا تھا۔ اگر یہ ادارے بھی نہ ہوتے تو آزادی کا وجود اس سرزمین پر دکھائی نہ دیتا اور سب آزادیاں دم گھٹنے کے باعث مرگئی ہوتیں۔

ایوب کے دور میں ــ اس سے پہلے ــ یحییٰ کے دور میں ــــــــ بھٹو کے دور میں

سچ بات کو جھوٹ کے پردوں میں نہ چھپاؤ اور اگر تمھیں سچائی کا علم ہو تو اس کو جان بوجھ کر اپنے تک نہ روکے رکھو۔ (قرآن حکیم)

۱۰ مارچ ۱۹۸۰ء جلد ۲ شمارہ ۲۳

ایڈیٹر
ضیا شاہد

اسسٹنٹ ایڈیٹر ــــ اختر کاشمیری
چیف رپورٹر ــــ خواجہ صباح

نمائندگان

کراچی:ــ الیاس شاکر ــ اسلام آباد ــ حبیب وہاب الخیری
پشاور:ــ یوسف لودی ــ برطانیہ ــ نسیم احمد باجوہ
حیدرآباد:ــ محمد علی خالد ــ فیصل آباد ــ قاری عبدالخالق
ملتان:ــ انور نظامی ــ کوئٹہ ــ سلیم اُبرو

کراچی آفس انچارج ــــ محمد شبیر
۲۹/۶ ڈی نرسری کمرشل ایریا، پی ای سی ایچ ایس کراچی
فون ــــ ۴۳۳۹۲۸

جنرل منیجر ــــ محمد اکرام
سرکولیشن منیجر ــ عبدالستار چودھری
پرنٹر:ــ محمد منیر قاضی ــ پبلشر:ــ ضیا شاہد
مطبع:ــ ملی پرنٹرز ــ ۹ سرکلر روڈ ــــ لاہور

قیمت ــ دو روپے

فون ۴۱۶۰۷۸

دفتر:ــ ۳۸ ملتان روڈ، لاہور

اور اب آپ کو کسی حاکم حتیٰ کہ سربراہِ مملکت سے شکایت ہے تو آپ اعلیٰ عدالتوں میں جا سکتے ہیں اور لوگ گئے اور عدلیہ نے کسی نہ کسی حد تک، ان تمام جکڑ بندیوں کے باوجود شکایت کنندہ کی تشفی کی۔ صرف ایک مثال دیکھئے، آج کل ملک میں مارشل لاء ہے اور مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا ہر فیصلہ قانون تصور کیا جاتا ہے۔ اس ملک کا عام شہری، شاید ہی خود مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سے ٹکرا سکتا ہو، لیکن اعلیٰ عدالتوں میں اس کے خلاف بھی مقدمہ لڑتا ہے اور حاکمِ وقت بھی خود یا وکیل کے ذریعے پیش ہو کر صفائی دیتا ہے۔ آج اعلیٰ عدالتوں میں صرف سیاسی مظلوم ہی نہیں، ہر مظلوم پہنچتا ہے۔ کسی کو حکومت سے شکایت ہے، کسی کو پولیس سے گلہ ہے، کوئی انتظامیہ کا ڈسا ہوا ہے، اپنی جان، مال اور عزت کے لیئے آپ کسی بھی وقت ان عمارتوں میں جا سکتے ہیں، جہاں ہر حکومت، ہر دور میں، ایک سے نظر آنے والے جج بیٹھے ہیں۔

موجودہ دور میں عدلیہ کا مقام اور ضرورت اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ ریاست کے تین ستونوں یعنی مقننہ، عدلیہ اور انتظامیہ میں سے مقننہ، غائب ہے، یعنی عوام کے منتخب نمائندوں پر مشتمل اسمبلیاں موجود نہیں۔ انتظامیہ کا راج ہے اور اسی ڈھانچے سے متعلق ایک حصہ، فوج جس کا اصل مقصد سرحدوں کی حفاظت ہے، سب سے زیادہ مصروف ہو گئی ہے، وہ مقننہ کی عدم موجودگی کے باعث خود ہی جزوی قانون سازی بھی کرتی ہے، جسے مارشل لاء کے ضوابط کی شکل میں نافذ کر دیا جاتا ہے۔ اس صورت میں شہری معاشرے کی طرف سے انتظامیہ سے اپنے حقوق حاصل کرنے کی جدوجہد کا آخری محور عدلیہ بن گئی ہے کہ نہ تو عوام کے نمائندے موجود ہیں جو ان کی آواز اٹھا سکیں اور نہ قانون ساز ادارے جو ان کی نت نئی، ضرورتوں کے پیشِ نظر نئے قوانین وضع کر سکیں۔ وزارتوں، اسمبلیوں اور سیاسی جماعتوں (جن کی سرگرمیوں پر بوجوہ پابندیاں عائد ہو چکی ہیں) کی عدم موجودگی میں عدلیہ کی ذمہ داریاں پہلے سے بھی بڑھ گئی ہیں اور قدرتی طور پر وہی عوام کا آخری سہارا بن گئی ہے۔ عوامی شعور کو اس ابتلا کے دور سے گزار کر اس وقت تک زندہ و تابندہ رکھنا جب تک ریاست کے تینوں ادارے ——— ——— دوبارہ اپنا اپنا کام شروع نہ کر دیں اور ان کے مابین وہ توازن برقرار نہ ہو جائے جو ایک آزاد معاشرے کے لئے ازبس ضروری ہے۔ شاید نہ چاہتے ہوئے بھی یہ فریضہ عدلیہ پر آن پڑا ہے۔

ان حالات میں پے در پے ایسے واقعات پیش آئے ہیں جن کا نوٹس لینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ سب سے پہلے "صحافت" کے ایک شمارے میں ہم نے سائمن ونچسٹر کے حوالے سے "السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا" کی ایک رپورٹ شائع کی جس کے مطابق ایک شخص ہاتھ میں بھری ہوئی مشین گن لئے ان کے پاس آیا اور کہا کہ اگر میرے محبوب مسٹر بھٹو کے خلاف فیصلہ دیا گیا تو میں چیف جسٹس کو قتل کر دوں گا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ کئی بار چیف جسٹس کے گھر اس خیال سے گیا ہے کہ سیکورٹی کا انتظام دیکھے۔ ونچسٹر کے بیان کے مطابق ایک وکیل صاحب جو مسٹر بھٹو کی پارٹی کے ورکر تھے، کہنے لگے کہ وہ یقیناً ایسا کرے گا۔

یہ مضمون السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا کے ۱۶ اکتوبر کے شمارے میں شائع ہوا اور ہم نے صحافت نمبر ۸ میں ۵ نومبر ۷۷ء کو اس کا حوالہ اردو میں چھاپا اور اس طرف توجہ دلائی کہ متذکرہ رجحان عدلیہ کے لئے جو ریاست کا اہم ترین شعبہ ہے کس قدر تباہ کن ہے۔

بعد ازاں ہائیکورٹ کے احاطے میں ہلڑ بازی ہوئی جس کے نتیجے میں مقدمۂ قتل کی کارروائی کے لئے پہرے لگانا پڑے — پھر نوبت یہاں تک پہنچی کہ چیف جسٹس صاحب نے مسٹر بھٹو کے ایک ریمارکس پر ان کے خلاف پولیس کو رپورٹ درج کرانے کی ہدایت کی — اسی مقدمے کی آخری سماعتیں بند کمرے میں ہوئیں اور اس کا جواز بھی عدالت نے یہ پیش کیا کہ کمرے کے باہر بعض لوگ ہنگامہ کرتے ہیں اور سکون سے کام نہیں کیا جا سکتا۔ اور سب سے آخر میں مقدمۂ قتل کا فیصلہ محفوظ ہونے کے بعد فیصلہ دینے والے تین ججوں کے گھروں پر فائرنگ ہوئی — اور بیگم نصرت بھٹو نے ایک بیان میں جس کی اشاعت پر پابندی لگا دی گئی، مگر جسے چھاپنے کے باعث مساوات کے ایڈیٹر، پرنٹر پبلشر حضرات کے خلاف فوجی عدالت نے کارروائی کی، یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ ہائیکورٹ سے مسٹر بھٹو کے مقدمات کو فوجی عدالت کے سپرد کیا جا رہا ہے۔

ان سب واقعات کے بارے میں ایک رائے جس کا عام طور پہ اظہار کیا جاتا ہے، یہ ہے کہ سب کچھ مسٹر بھٹو کے حامی کرواتے ہیں، لیکن ہم کسی ثبوت کے بغیر کسی پر کوئی الزام دینا نامناسب سمجھتے ہیں، لہٰذا اس کے دوسرے امکانات کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیئے، کیونکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بعض شرپسند طاقتیں اور پاکستان کے اندرونی اور بیرونی دشمن، عدلیہ کو جس کے سہارے ریاست کا ڈھانچہ کھڑا ہے، تباہ کر کے اس ملک کی اینٹ سے اینٹ بجانا چاہتی ہوں، اس مقصد کے لیئے مسٹر بھٹو کے حامیوں کو محض ایکسپلائٹ کیا جا رہا ہو یا یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے حامی ان حرکات کے سرے سے مرتکب ہی نہ ہوں اور یہ کام ان کے نام پہ منفی سوچ رکھنے والے ملک دشمن عناصر کر رہے ہوں، لیکن "منظر نامہ" ایسا لکھا جا رہا ہو کہ پیپلز پارٹی اور مسٹر بھٹو ہی قصوروار نظر آئیں۔

وجہ جو بھی ہو، ہمیں ہر قیمت پر عدلیہ کو بچانا ہو گا — کہ عدلیہ اس ملک کے مظلوم اور بدقسمت عوام کا آخری سہارا ہے۔ اور اسے داغدار کرنے والے خواہ دانستہ ایسا کر رہے ہوں، یا نادانستہ، ہماری نظر میں اس ریاست کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہیں۔ پیپلز پارٹی اور مسٹر بھٹو سے ہمیں جو اختلاف رہا، اس کے باوجود ہم نے "صحافت" کے صفحات پر ہمیشہ اپنی طرف سے یہ مطالبہ کیا کہ ان سے کوئی بے انصافی نہیں ہونی چاہیئے (ملاحظہ کیجئے اداریہ صحافت نمبر ۶، ۱۶ اکتوبر ۷۷ء) ہم نے اس ملک میں سب سے پہلے یہ کہا کہ ان پر کھلی عدالت میں مقدمے چلنے چاہئیں تاکہ انہیں اپنی صفائی دینے کا پورا موقع ملے۔ اس اداریے کے آخر میں بھی ہم نے قرآن حکیم کی اس آیت کا ترجمہ لکھا تھا کہ:

"خبردار، کسی شخص سے تمہاری دشمنی تمہیں اس بات کی ترغیب نہ دے کہ تم انصاف نہ کرو، انصاف ہی کرو، کہ انصاف تقویٰ کے نزدیک تر ہے۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو کہ وہ تمہارے اعمال سے بخوبی واقف ہے۔"

ہماری کوشش رہی ہے کہ اپنے تمام تر تعصبات کے باوجود (جو شاید انسانی فطرت کا حصہ ہیں سب کے لیے انصاف چاہیں کہ اسی طرح ہم منصفانہ معاشرے کی تشکیل دے سکتے ہیں) اختلاف رائے کو اختلاف رائے ہی تک رکھنے کی روایت قائم ہو جائے تو ہمارے بہت سے مسائل حل ہو سکتے ہیں کہ ہمارے ہاں اختلاف رائے، ذاتی اور جانی دشمنی کی ایک شکل ہے اور ہم میں سے ہر شخص

مخالف رائے رکھنے والے کا گلا کاٹنا اور اسے زندہ زمین میں دفن کرنا چاہتا ہے اور اس صورت حال کے باعث انتخابات کی بجائے یہاں سیاسی سرگرمیوں پر پابندیاں لگنے تک نوبت پہنچ گئی ہے۔

ہم پوری نیک نیتی سے، عاجزی سے، اور خلوص سے مسٹر بھٹو کے حامیوں سمیت، تمام سیاسی جماعتوں، گروہوں، اخبار نویسوں اور دانشوروں سے درخواست کرتے ہیں کہ عدلیہ کو تباہ کرنے یا اس کے کام میں رکاوٹ ڈالنے کی بجائے اسے مضبوط و مستحکم بنائیں۔

اس سلسلے میں ہم موجودہ حکمرانوں سے بھی مطالبہ کریں گے کہ وزیراعظم ہاؤس سے بھی زیادہ محفوظ جگہ ایک جج کا گھر ہونا چاہیے اور اگر ہماری لا اینڈ آرڈر قائم کرنے والی طاقتیں گذشتہ سال "لانگ مارچ" کے موقع پر وزیراعظم ہاؤس کو بچانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا سکتی ہیں اور بے دریغ گولی چلا سکتی ہیں تو ججوں کے گھروں اور عدل کے اداروں کو شر پسندوں، چوروں اور چوروں کے ساتھیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے کسی قسم کی ڈھیل نہیں ہونی چاہیے۔

—— جہاں تک مسٹر بھٹو کے مقدمۂ قتل کا تعلق ہے، اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ فیصلہ کیا ہو گا، لیکن جو بھی فیصلہ ہو، اس کے خلاف انہیں اپیل کرنے کا حق ہو گا۔ اور اپنی بے گناہی ثابت کرنے کا انہیں پورا پورا موقع میسر ہو گا کہ یہی قانون کا تقاضا ہے۔ ہماری رائے میں ان کی عزت اسی میں ہے کہ وہ کسی عدالت سے باقاعدہ رہائی پائیں، توڑ پھوڑ یا تشدد کے ذریعے انہیں ملنے والی "رہائی" نہ تو ان کے لیے مفید ہو گی اور نہ ان کی جماعت کے لیے۔ ہر انسان کی زندگی میں اچھے بڑے ہر قسم کے دور آتے ہیں اور بڑے انسان وہی ہوتے ہیں جو اس دور میں مستقل مزاج، متحمل اور ثابت قدم رہتے ہیں۔ سب پاکستانیوں کو خواہ ان کا تعلق کسی جماعت سے ہو، پاکستان میں رہنا ہے اور جس قوم کے منصفوں کی زندگیاں محفوظ نہ رہیں یا ایسا کرنے کی کوشش کی جائے وہ کبھی زندہ نہیں رہ سکتی۔ اگر ہم نے خودکشی کا فیصلہ نہیں کر لیا تو ہمیں عدالتوں کو آزادانہ طور پر کام کرنے کا موقع دینا ہو گا، ان پر اعتماد کرنا ہو گا اور ججوں کی کوٹھیوں پر پولیس کا نہیں بلکہ احترام و عقیدت کے پہرے بٹھانے ہوں گے —— بصورت دیگر کوئی ایک فرد یا گروہ تو شاید اپنے مقاصد (نیک یا بد) حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے، لیکن وہ اس ملک کو ایسے جنگل میں ضرور تبدیل کر دے گا جس میں کسی کی جان محفوظ ہو گی نہ عزت، نہ یہاں کوئی حکومت ہو گی نہ عدالتیں —— اور داد ہو گی نہ فریاد۔

خدا نہ کرے کہ وہ وقت آئے کہ

ایسا وقت کسی کیلئے بھی فائدہ مند نہ ہو گا۔
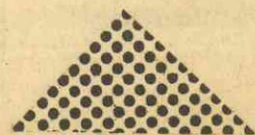
مسٹر بھٹو کے مقدمہ قتل کے بارے میں بیگم نصرت بھٹو کے متنازعہ اخباری بیان پر

حبیب الوہاب الخیری کی لاہور ہائیکورٹ میں مکمل درخواست کا متن

بیگم نُصرت بُھٹو کے خلاف توہینِ عدالت کی درخواست

بعدالت لاہور ہائی کورٹ لاہور

حبیب الوہاب الخیری ایڈووکیٹ ہائی کورٹ ۵۲۰ بی

سٹیلائٹ ٹاؤن راولپنڈی۔

.... سائل

بنام

(۱) مسماۃ نصرت بھٹو، زوجہ ذوالفقار علی بھٹو

گلبرگ لاہور

(۲) بشیر الاسلام عثمانی ناشر و مدیر روزنامہ تعمیر ۲۴ العباس مارکیٹ، صدر راولپنڈی

(۳) شیخ سعید احمد تابع روزنامہ تعمیر، ٹی ایس پرنٹرز گوالمنڈی راولپنڈی۔

.... مسؤل علیہم

درخواست زیر آرٹیکل ۲۰۴ آئینِ اسلامی جمہوریہ پاکستان

یہ درخواست بھی سماعت کے لیے منظور ہو گئی

۱۵ مارچ ۷۸ء کو لاہور ہائی کورٹ کے جناب جسٹس جاوید اقبال نے قتل کے ایک ملزم ذوالفقار علی بھٹو کی اہلیہ مسماۃ نصرت بھٹو کے خلاف توہین عدالت کی کارروائی کا معاملہ عدالت عالیہ کے اس مکمل بنچ کے سپرد کر دیا ہے جو قتل کے مقدمے کی سماعت کر رہی ہے۔ یہ بنچ چیف جسٹس جناب جسٹس مشتاق حسین اور دو چار ججوں ——— پر مشتمل ہے۔

توہین عدالت کی کارروائی کے لیے درخواست راولپنڈی کے ایک وکیل جناب حبیب الوہاب الخیری ایڈووکیٹ نے ۱۴ مارچ کو عدالت عالیہ لاہور میں پیش کی تھی جس کی باقاعدہ سماعت ۱۵ مارچ کو جناب جسٹس جاوید اقبال نے فرمائی اور اپنے مختصر حکم کے ذریعے معاملہ مکمل بنچ کے سپرد کر دیا۔ اس کے ساتھ درخواست کا مکمل متن پیش ہے۔

دفعہ ۳ قانون توہین عدالت۔

مصادرہ ۱۹۷۶ء برائے کارروائی بہ الزام

توہینِ عدالت

سائل مؤدبانہ عرض کرتا ہے:

(۱) کہ سائل عدالت عالیہ میں وکالت کرنے کا مجاز ایک وکیل ہے۔ جو اعلیٰ عدالتوں کے وقار کو تباہ کرنے والے سازشی ٹولے کے خلاف ہمیشہ برسرِپیکار رہا ہے۔ اس ٹولے کا سرغنہ بھٹو تھا جو اقتدار سے تو محروم ہو گیا ہے تاہم اپنی مہم سے باز نہیں آیا ہے۔ اس ٹولے کی قیادت اب اس کی اہلیہ مسماۃ نصرت بھٹو نے سنبھال لی ہے اور وہ پاکستان کے سادہ لوح عوام کو ورغلا کر فاضل عدالت کے خلاف کارروائیوں پر ابھار رہی ہے۔

(۲) کہ مسماۃ بھٹو نے ۱۱ مارچ ۱۹۷۸ء کو لاہور سے تخریب کاروں کے نام ایک اپیل جاری کی جسے پیپلز پارٹی کے حامی اخبارات میں شہ سرخیوں کے ساتھ شائع کیا گیا چنانچہ روزنامہ تعمیر راولپنڈی مورخہ ۱۲ مارچ میں بھی وہ جلی طور پر شائع ہوئی۔ اس اخبار کے آٹھ کالم پر پھیلی ہوئی سرخی "چیئرمین بھٹو کو سزائے موت سے بچایا جائے، بیگم بھٹو" ہے۔ یہ درحقیقت بھٹو کے حامی اور اجرتی تخریب کاروں کے نام اپیل ہے جس میں واضح طور پر ترغیب دی گئی ہے کہ عدالتِ عالیہ اور بھٹو کے مقدمہ کی سماعت کرنے والے فاضل ججوں کے خلاف مجرمانہ کارروائی کی جائے۔ اس طرح نہ صرف فاضل ججوں کی رائے کو متاثر کرنے کی کوشش کی گئی ہے بلکہ ان پر حملے کرا کے انہیں انصاف کے مطابق فیصلے کرنے سے روکنے کی تدبیر کی گئی ہے۔

(۳) کہ شائع شدہ اس اپیل میں "متوقع ردِعمل" کے الفاظ سے یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ فیصلہ سنتے ہی عوام عدالت اور ججوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے جو حقیقت کے تو بالکل برعکس ہے تاہم مجرمانہ کارروائی کے لیے ترغیب کا ایک نفسیاتی حربہ ہے جو نہایت چالاکی کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے اور اس کا مطلب واضح طور پر یہ ہے کہ جس ردِعمل کی توقع کی جا رہی ہے اسے بروئے کار لایا جائے۔

(۴) کہ مسئول علیہا نمبر ۱ بیگم نصرت بھٹو نے متعلقہ اخبار پڑھنے والوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ مقدمہ کی سماعت کرنیوالے ۵ فاضل جج انصاف کے بجائے انتقام کی کارروائی کر رہے ہیں اور بھٹو جو بزعم خویش قائدِ عوام ہے، وہ فاضل ججوں بلکہ پوری عدلیہ پر اعتماد نہیں رکھتا، اس پر انصاف کے دروازے بند ہیں۔ اس نے مقدمہ کی ساری کارروائی میں تو بھرپور حصہ لیا، استغاثہ کے گواہوں پر اچھی طرح جرح کی اور جب اسے اپنے دفاع میں پیش کرنے کو کچھ نظر نہ آیا تو اس نے عوام کو بیوقوف بنانے کے لیے بائیکاٹ کا ڈھونگ رچایا جو بذاتِ خود توہین عدالت کا جرم تھا۔ اسے فاضل عدالت نے بہ کمال رحم نظر انداز فرما دیا، لیکن اب مسئول علیہا نمبر ۱ اسے دہرا کر اس کی تشہیر کر رہی ہے۔ اس ضمن میں اس کے الفاظ یہ ہیں "مسٹر بھٹو کا مسلسل یہ موقف رہا ہے کہ انہیں ہائی کورٹ کے اس بنچ سے انصاف کی توقع نہیں مگر ان کی کوئی شنوائی نہیں ہوئی بالآخر انہیں مقدمہ کا بائیکاٹ کرنا پڑا"۔

(۵) کہ مسئول علیہا نمبر ۱ بیگم نصرت بھٹو نے کہا ہے کہ "استغاثہ کے گواہان کے بیانات کھلی عدالت میں قلمبند کیے گئے، مگر مسٹر بھٹو کا بیان صفائی بند کمرے میں لیا گیا اور وہاں بھی انہیں بات کرنے کی اجازت نہیں دی گئی"۔

اس طرح اس نے معصوم عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ قتل کے ملزم بھٹو کو دفاع کا موقع نہیں دیا جا رہا۔ اس تاثر کو عام کرنے کے لیے اس نے جان بوجھ کر یہ حقیقت چھپائی ہے کہ ملزم عدالتی کارروائی کو عدالت کے خلاف عناد پھیلانے کا ذریعہ بنا رہا تھا جبکہ ہر جھوٹے سچے بیان کا اخبارات میں تفصیلاً شائع کرانا کسی ملزم کا قانونی حق بھی نہیں ہے۔ وہ عدالتی طریقۂ کار سے ناجائز فائدہ حاصل کر کے بعض افراد کو جرائم کے ارتکاب پر اکسانا چاہتا ہے جس کی اجازت نہیں دی جا سکتی تھی۔

(۶) کہ مسئول علیہا بیگم نصرت بھٹو کی شہ پر ہی جرائم پیشہ اجرتی تخریب کار عدالتِ عالیہ کے تین فاضل ججوں کے بنگلوں پر ہوائی فائر کرتے رہے ہیں اور ٹیلی فون پر بھی فاضل ججوں کو دھمکیاں دیتے رہے ہیں۔ اس اپیل کا مجموعی تاثر بھی ایسی کارروائیوں کی حوصلہ افزائی ہے۔ اگر عوام واقعی ملزم کے طرفدار ہوتے تو اس شہ کے بعد ان کے شر سے ملک کی کوئی عدالت محفوظ نہ رہتی اور قانون کے خلاف بغاوت پھیل جاتی، لیکن عوام نے قتل کے ملزم کو بچانے کے لیے تخریبی سرگرمیوں میں مسماۃ نصرت بھٹو کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا ہے اور اب اس کا انحصار صرف اجرتی تخریب کاروں پر ہی رہ گیا ہے جس کے لیے وہ عوام کی لوٹی ہوئی دولت استعمال کر سکتی ہے۔

(۷) کہ مسئول علیہم ۲ اور ۳ روزنامہ تعمیر راولپنڈی کے طابع ناشر و مدیر ہیں۔ انہوں نے خود بھی توہین عدالت کا جرم کیا ہے اور مسئول علیہا نمبر ۱ کے جرم میں اعانت بھی کی ہے جو قابلِ سزا ہے۔

(۸) کہ مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں مسئول علیہم توہینِ عدالت کے مرتکب ہوئے ہیں جس کے لیے قانون کے مطابق سخت ترین سزا ضروری ہے۔

اندریں حالات سائل مستدعی ہے کہ الزام علیہم کو توہینِ عدالت کے جرم میں سخت ترین سزا دی جائے۔

(تاریخ ۱۴ مارچ ۷۸ء)

حبیب الوہاب الخیری

صحافت کی خصوصی رپورٹ

الیاس شاکر

کراچی میں تاریخ کی سب سے بڑی آگ

۱۱ مارچ ۔ کراچی میں آگ اور دھوئیں کا دن تھا۔ ہر سڑک پر شور مچاکر بھاگتی ہوئی فائر بریگیڈ کی گاڑیاں گزر رہی تھیں جس سے احساس ہوتا تھا کہ کوئی غیر معمولی سانحہ ہوگیا ہے۔ شہر کی بڑی بڑی سڑکوں سے بندرگاہ اور سٹی ریلوے اسٹیشن کی طرف سے آسمان سے باتیں کرتے ہوئے شعلے اور ان کی دہشت انگیز سرخی نظر آتی تھی۔ شہریوں کا جذبۂ تجسس اور سب کچھ جاننے کی خواہش ابھر آئی تھی، ہر سمت سے گاڑیاں، موٹر سائیکلیں اور عوام کے ٹھٹھ آگ کا نظارہ کرنے اور اس کا سبب جاننے کے لئے آرہے تھے، لیکن تمام راستے بند تھے اور ان پر فوج کا مکمل کنٹرول تھا۔

پاکستان کی تاریخ کی اس خوفناک آتشزدگی کے بلند ہوتے ہوئے شعلوں میں ہمارے ملک کا قیمتی سرمایہ جل رہا تھا، ہر شخص اداس تھا، افسردہ تھا اور اس کے ذہن میں ایک ہی سوال تھا کہ یہ آگ از خود لگی ہے یا اس کے پس منظر میں کوئی شرارت یا سازش ہے۔؟

ٹی پی ایکس کے گودام میں لگنے والی یہ آگ اپنی نوعیت اور تباہی کے لحاظ سے انتہائی مختلف نوعیت کی تھی، جس نے کوینز روڈ پر نصف میل کے علاقے میں بکھرے ہوئے گودام کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ آگ پر قابو پانے کے تمام حربے ناکام ہو رہے تھے، اس لیے بالآخر ہنگامی حالت کا اعلان کرکے مسلح افواج، ائیر فورس، بحریہ اور کراچی پورٹ ٹرسٹ کے عملے کی مدد حاصل کی گئی، لیکن پندرہ گھنٹے کے اندر بھی آگ پر قابو نہیں پایا جاسکا، جس کے باعث تقریباً چھ کروڑ روپے کا نقصان کا اندازہ لگایا گیا ہے۔ محتاط اندازے کے مطابق ایک لاکھ روئی کی گانٹھیں اور چاول کی ہزاروں بوریاں جل کر خاکستر ہوگئیں۔

کراچی پورٹ ٹرسٹ کے وانچ اینڈ وارڈ چوکیدار کمال حسین جو اس آتشزدگی کے عینی شاہد ہیں، کا کہنا ہے کہ یہ آگ دن کے ڈیڑھ اور پونے دو بجے کے درمیان لگی۔ آگ گیٹ نمبر ۵ کے قریب واقع شیڈ نمبر آٹھ یا نو سے بھڑکی تو اس نے ٹی پی ایکس گودام میں لگے ہوئے قدیم سسٹم کے فائر الارم کا شیشہ توڑ کر فائر بریگیڈ کو اطلاع دی۔ اس سے قبل کہ کراچی پورٹ ٹرسٹ کے فائر بریگیڈ کی گاڑیاں وہاں پہنچتیں، تیز ہوا کے سبب آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کرتے ہوئے تین چار شیڈوں کو اپنی لپیٹ میں لے چکے تھے۔

آگ لگنے کی وجہ

تحقیقاتی ٹیم ابھی تک اس نتیجے پر نہیں پہنچ سکی کہ آگ کیسے لگی، لیکن قیاس ہے کہ ایک روز قبل ایک مقامی تجارتی ادارے کے گودام میں لگنے والی آگ اس خوفناک آتشزدگی کا سبب بنی۔ اس آگ کے بارے میں کہا جارہا ہے کہ یہ یارڈ میں شنٹنگ کرتے ہوئے ایک ریلوے انجن سے نکلنے والی چنگاریوں سے لگی تھی، جس کے نتیجے میں روئی کی دو ہزار گانٹھیں جل کر تباہ ہوگئی تھیں۔ کراچی پورٹ ٹرسٹ کے قریبی ذرائع نے بتایا ہے کہ آگ بجھانے کے بعد ان گانٹھوں کو متاثرہ جگہ پر ہی رہنے دیا گیا، جس میں آگ کی دبی ہوئی چنگاریاں موجود تھیں۔ ممکن ہے کہ وہی دبی ہوئی چنگاریاں اس خوفناک آتشزدگی کی تمہید بنی ہوں، لیکن شہری حلقوں کا کہنا ہے کہ ایک روز قبل لگنے والی چھوٹی آتشزدگی کو عوام سے کیوں چھپایا گیا، جس کے بطن سے اس خوفناک آگ کے شعلوں نے جنم لیا اور ملک اور قوم کا بے پناہ قیمتی سامان ضائع ہوا۔

یہ آگ نئی نہیں

پورٹ ٹرسٹ کے گوداموں میں لگنے والی آگ نئی یا منفرد نہیں، لیکن اس آگ نے رائے عامہ کو اس لیے فوری طور پر حیرت میں ڈال دیا کہ ملک کا ایک سیاسی حلقہ مسلسل تشدد اور تخریب کاری کی بعض وارداتوں میں ملوث پایا گیا ہے۔ یا اس نے خود کو ان اتفاقی حادثات کا خالق گردانا ہے اور وہ عام آدمی کے سکون کے لئے ایک چیلنج بن گیا ہے۔ سوچ کے اس منطقی پہلو نے عوام کو

جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور وہ حقیقتوں کی تلاش میں افواہوں، قیاس آرائیوں اور بے بنیاد باتوں کو بھی صحیح سمجھنے لگے ہیں، لیکن ان تمام حقائق کے باوجود کہ اس قسم کی آگ چند سال بعد کسی نہ کسی گودام کی قسمت میں ضرور لکھی ہوتی ہے، رائے عامہ کے ایک بڑے طبقے کا خیال ہے کہ یہ تخریب کاری کی ایک کوشش ہے اور ان کا الزام لیاری کی ان چالیس عورتوں کی طرف بھی جاتا ہے جو روئی کے اڑتے ہوئے گالے چننے کے لئے آتی ہیں اور اس طرح اپنا پیٹ بھرتی ہیں۔ کراچی پورٹ ٹرسٹ میں ایک جماعت کے بھرتی کردہ کارکنوں کی ٹیم اس کام کو زیادہ بہتر انداز میں کر سکتی تھی اور ممکن ہے انہوں نے کوئی کھیل دکھایا ہو یا کم از کم آگ بجھانے کے انتظامات میں ہی پیچیدگیاں پیدا کی ہوں۔ بہر حال یہ محض قیاس آرائیاں ہیں جن کو باقاعدہ تحقیقات ہی کسی نتیجے پر پہنچا سکتی ہے۔

بار بار آگ کیوں؟

شاید قارئین کو یاد ہو کہ کراچی کی بندرگاہ اور اس کے اطراف میں پھیلے ہوئے گوداموں میں اکثر اس قسم کی آتشزدگی کی وارداتیں ہوتی رہتی ہیں۔ ماضی میں اس آگ کی دلچسپ بات یہ ہوتی تھی کہ ہمیشہ آگ کے نتیجے میں ریکارڈ جل جاتا تھا۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا آگ صرف ریکارڈ کو نذر آتش کرنے کے لئے تو نہیں لگائی جاتی کیونکہ گوداموں سے اکثر سامان غائب ہوتا رہتا ہے۔ شاید دو تین سال کے بعد ریکارڈ چیک کرنے کے لئے سارا ریکارڈ ہی نذر آتش کر دیا جاتا ہے کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری!! اگر یہ آگ بھی ریکارڈ کو نذر آتش کرنے والی مہم کا حصہ تھی تو انتہائی وحشیانہ اور ظالمانہ فعل تھا کہ صرف چند لاکھ کے گھپلے کو چھپانے کے لیے ملک و قوم کا چھ کروڑ روپیہ ضائع کر دیا گیا۔ اس سے تو زیادہ یہ بہتر ہے کہ حکومت خود سالانہ چند لاکھ روپے کی بدعنوانیوں کی چھوٹ دے دے تاکہ ان بے ایمان افسروں کو "آتشزدگی" کی زحمت نہ کرنی پڑے جن سے نجات پانا اب اس ملک میں کچھ مشکل نظر آنے لگا ہے۔

آگ! آگ! آگ

ٹی پی ایکس گودام میں جہاں روئی اور چاول جیسی برآمد کی جانے والی اشیاء رکھی جاتی ہیں گذشتہ تیس برسوں کے دوران آتشزدگی کا یہ تیسرا بڑا واقعہ تھا۔ ان گوداموں میں آگ لگنے کا پہلا بڑا واقعہ ۱۹۴۸ء میں ہوا جس میں بھاری نقصان کا سامنا کرنا پڑا اور آگ پر مشکل قابو پایا گیا۔ ۱۹۶۹ء میں اسی گودام میں دوبارہ آگ لگی جو مسلسل چار دن تک نہ بجھ سکی۔ اس سے روئی کی تقریباً ڈیڑھ لاکھ گانٹھیں جل کر تباہ ہو گئیں اور کروڑوں روپے کا نقصان ہوا۔ ۱۱ مارچ ۱۹۷۸ء کو جو آگ لگی وہ ۱۹۶۹ء میں لگنے والی آگ سے زیادہ مختلف نہیں تھی جس پر قابو پانے کے لئے انتہائی محنت کرنی پڑی، روئی کی گانٹھوں کو منتقل کرنا پڑا یا آگ کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا پڑا۔ یہ بات عام طور پر دیکھنے میں آئی ہے کہ گودام میں کھلی ہوئی روئی ادھر ادھر بکھری ہوتی ہے۔ جبکہ حفاظتی اصول کے مطابق روئی کی سو گانٹھوں کے بنڈل کو آپس میں سو فٹ کے فاصلے پر رکھنا چاہیئے لیکن گودام میں اس اصول پر عمل نہیں کیا گیا۔ ٹی پی ایکس گودام میں تقریباً چار لاکھ گانٹھیں رکھنے کی گنجائش ہے۔

گزٹ نوٹیفکیشن، عمل کب ہو گا؟

ٹی پی ایکس گودام میں آتشزدگی کے بعد یہ بات

انتہائی کرب کے ساتھ محسوس کی گئی کہ آگ کے بھڑکنے کی ایک وجہ یہ بنیادی غلطی تھی کہ روئی کی گانٹھیں باہم ملی ہوئی تھیں اور درمیان میں کوئی راستہ نہ ہونے کے باعث فائر بریگیڈ کے عملے کا آگ کے مرکز تک جانا ناممکن ہو گیا تھا۔ جبکہ گوداموں کو آگ سے محفوظ رکھنے کے لئے وزارت مواصلات نے ۱۹۷۲ء میں غیر معمولی گزٹ نوٹیفکیشن جاری کیا تھا اس میں اس بات کی وضاحت تھی کہ گودام میں جہاں روئی رکھی گئی ہو وہ پختہ ہونا چاہیئے اور جو چاروں طرف سے محفوظ ہو۔ اس میں روشن دان بھی ہو، ہر گودام کے درمیان کم از کم ۷۵ فٹ کا فاصلہ ہونا چاہیئے اور ان گوداموں میں گیٹ اور دروازے اس طرح ہوں کہ کسی گودام کی آگ دوسرے گودام میں نہ جانے پائے۔ نیز گودام کے کمپارٹمنٹ میں روئی کی پانچ ہزار سے زیادہ گانٹھیں نہیں ہونی چاہئیں۔ اس کے علاوہ روئی کھلے آسمان کے نیچے نہ رکھی جائے اور تمام گانٹھوں پر کاٹن جننگ اور پیکنگ فیکٹریوں کی مہر ثبت ہو اور تمام گانٹھیں اس طرح پیک کی گئی ہوں کہ ان میں بل اور چکنائی نہ ہو، لیکن ٹی پی ایکس کے گودام میں صورتحال اس کے برعکس ہے کوئی بھی شیڈ مکمل طور پر محفوظ طریقوں سے تعمیر نہیں کیا گیا۔ روئی کی گانٹھیں کھلے آسمان کے نیچے پڑی ہوئی تھیں اور گانٹھوں کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں تھا۔

کیا یہ تخریب کاری ہے؟

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ تخریب کاری تھی تو بھی گوداموں میں گانٹھیں اور چاول کی بوریاں کسی قاعدے اور اصول سے رکھی جاتیں تو اس قدر نقصان نہ ہوتا اور نہ آگ کے شعلے یوں بھڑکتے۔ کیا کراچی پورٹ ٹرسٹ کی نااہل اور غیر فرض شناس انتظامیہ اپنی غفلت کے باعث اس عظیم قومی نقصان میں ملوث نہیں؟ کیا تحقیقات کرنے والی کمیٹی کا ہاتھ فرائض اور اصولوں سے غفلت برتنے والوں تک پہنچ سکے گا؟

بہر حال پاکستان کے شہری اس انتظار میں ہیں کہ کب ان سوالوں کا جواب ملتا ہے جو آگ کی خبر پڑھنے کے بعد ذہنوں میں ابھرے، مثال کے طور پر۔

۱: گودام میں روئی ڈھیروں کی شکل میں کیوں پائی گئی

۲: روئی کی گانٹھوں میں آگ آہستہ آہستہ پھیلتی ہے، کاغذ کے ڈھیر کی طرح ایک دم نہیں بھڑکتی پھر کیا وجہ ہے کہ گودام میں آگ اچانک بھڑک اٹھی۔

۳: گودام کا حفاظتی عملہ کتنا تھا اور اس وقت کہاں تھا۔ اتنے بڑے گودام کی حفاظت کے فرائض کس کے ذمے ہیں اور کیا ان کو قرار واقعی سزائیں دی جا رہی ہیں۔

خاص مضمون

ملک معیشت کو دس ارب روپے کا نقصان پہنچانے والوں کو بے نقاب کیا جائے۔ نقائص دور کرنے پر ایک ارب ستر کروڑ روپے کا تخمینہ سرکاری طور پر لگایا گیا ہے۔

تربیلا ڈیم کا شرمناک سکینڈل

ایم اے عزیز

تربیلا ڈیم میں گذشتہ دنوں خطرناک نقص پیدا ہوا اور اس کی اس موجودہ خرابی کو دور کرنے پر ایک ارب روپیہ کی خطیر رقم صرف کرنے کی خبر ملک کے تمام قومی اخبارات میں سرکاری طور پر دس نومبر ۱۹۷۷ء کو چھپ چکی ہے۔

اس عظیم بند کی تعمیر کا افتتاح ۴ر نومبر ۱۹۶۸ء کو سابق صدر مرحوم فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے کیا تھا۔ پروگرام کے مطابق اس بند کو ۱۹۷۳ء میں مکمل ہونا تھا لیکن ایوب خان کے بعد اس بند کی تعمیر کی صحیح رفتار برقرار نہ رہ سکی، ۱۹۷۲ء میں مسٹر بھٹو کی آمرانہ حکومت کے قیام کے بعد ذخیرہ آب کا یہ عظیم منصوبہ دیگر قومی اور سرکاری اداروں کی طرح بھٹو آمریت کی دست برد سے محفوظ نہ رہا، بلکہ سیاست کا شکار ہو کر رہ گیا۔

موجودہ حکومت کے آغاز میں بعض بڑے بڑے اداروں واپڈا، ریلوے، ٹرانسپورٹ، نیشنل کنسٹرکشن کمپنی، کراچی پورٹ ٹرسٹ، نیشنل شپنگ کارپوریشن، پاپولیشن پلاننگ ڈویژن اور پورٹ قاسم میں ہونے والی سنگین بدعنوانیوں کے معاملات کی تحقیقات کا آغاز ہو چکا ہے مگر حیرت اور تعجب ہے اس بات پر کہ تربیلا ڈیم میں ہونے والی مبینہ بدعنوانیوں، قومی دولت کو لوٹنے، خرد برد کرنے قومی معیشت کو تباہ کرنے اور نقصان پہنچانے کی طرف اب تک کسی کی نظر نہیں گئی۔ چیئرمین واپڈا، میجر جنرل فضل رزاق نے خود اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ واپڈا کو اپنے کاموں کے لئے کروڑوں روپیہ کا سامان خریدنا پڑتا ہے اور اس میں بے پناہ بدعنوانیوں کا ارتکاب ہوا ہے۔ ایک گاؤں میں ایک معمولی لائن پہنچانے کے لئے چالیس لاکھ روپیہ وصول کیا گیا اور یہ کہ تربیلا ڈیم کی سرنگ نمبر ۴ کی از سر نو مرمت پر پچیس کروڑ روپے صرف ہوں گے۔

(نوائے وقت ۱۵ر جولائی ۱۹۷۷ء)

کیا یہ بات باعث تعجب نہیں کہ تربیلا بند کی مرمت کا جائزہ لینے والے اعلیٰ مشیروں کا اجلاس پاکستان میں منعقد ہونے کے بجائے نیویارک میں ہوتا ہے۔ گذشتہ ماہ کے اواخر میں چیئرمین واپڈا میجر جنرل فضل رازق کے ہمراہ میاں خلیل الرحمٰن، ڈیم کے منیجر چودھری گلزار احمد اور نیشنل کنسٹرکشن کمپنی کے منیجنگ ڈائریکٹر ارشاد احمد نے از سر نو مرمت کے مسائل پر واشنگٹن میں ہونے والے "جائزہ اجلاس" میں شرکت کی۔ اس طرح صرف ایک مشاورتی جائزہ کمیٹی میں شرکت کرنے کے لئے کئی لاکھ روپیہ کا خرچہ ہوا جو پاکستان جیسے غریب ملک کے لئے بوجھ سے کم نہیں۔

تربیلا ڈیم ۱۹۷۴ء سے برابر کسی نہ کسی خرابی کا شکار ہوتا چلا آ رہا ہے اور از سر نو مرمت کا خرچ بڑھ رہا ہے۔ جنرل منیجر کے مطابق تمام نقائص دور ہونے تک جو ان کے خیال میں قریب الختم ہیں، کل خرچ ایک ارب ستر کروڑ تک پہنچ جائے گا۔

(جنگ ۲۸ر جولائی ۷۷ء)

تربیلا ڈیم کی تکمیل میں تاخیر کی وجہ سے اب تک پاکستان کو نو ارب روپیہ کا نقصان ہو چکا ہے۔

(اصغر خان، جنگ کراچی صفحہ ۸ کالم ۱)

تربیلا کے مشیر انجینیئر ٹامس اور ٹھیکیدار (ٹی ٹربیلا جوائنٹ وینچرز) کی اعلیٰ کارکردگی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۷۴ء میں تربیلا میں خرابی پیدا ہونے کی وجہ سے ربیع کی دو فصلوں اور خریف کی ایک فصل کے لئے پانی فراہم نہ ہونے سے پاکستانی معیشت کو تقریباً دس ارب روپیہ کا نقصان ہو چکا ہے۔ مذکورہ نقصان پاکستان کی برآمدات سے زر مبادلہ کی مجموعی آمدنی کے برابر ہے۔

(نوائے وقت ۹ر اکتوبر ۷۵ء)

تربیلا کا منصوبہ پاکستان کی معیشت کے لئے ریڑھ کی ہڈی کے مماثل ہے۔ اس سے ساڑھے چھ کروڑ مکعب ایکڑ فٹ پانی زرعی مقاصد کے لئے حاصل ہوگا اور ۲۱ سو میگاواٹ بجلی پیدا کی جا سکے گی جو پاکستان کی صنعتی اور زرعی ترقی کے لئے نعمت غیر مترقبہ سے کسی طرح سے کم نہیں ہے۔ ۱۴ر مئی ۶۸ء کو (T J V) تربیلا جوائنٹ وینچرز ایک غیر ملکی فرم کو ۲۷۵ کروڑ روپیہ مالیت کا ٹھیکہ دیا گیا، ڈیم کا آبی منصوبہ کا ذخیرہ ۱۵۵۰ فٹ اونچا ہے جس کی لمبائی پچاس میل ہے اور اس میں ایک کروڑ مکعب ایکڑ فٹ پانی کا ذخیرہ کیا جا سکتا ہے۔ غیر ملکی ماہرین پر مشتمل ایک بورڈ مستقلاً اس کی نگرانی پر مامور ہے۔ منگلا ڈیم کی سرنگ نمبر ایک اور دو بجلی پیدا کرنے اور سرنگ نمبر تین اور چار آب پاشی کے لئے مخصوص ہیں۔ سرنگ نمبر پانچ کی تعمیر پاکستان کے ماہر انجینیئروں کی مہارت کا عظیم شاہکار ہے۔ بدقسمتی سے یہ عظیم الشان منصوبہ تکمیل کے مراحل کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی حادثہ کا شکار ہو گیا۔ ۱۹۷۴ء میں محمد حیات خان شیرپاؤ کی وزارت کے دوران اس منصوبہ کو زبردست نقصان پہنچا، اس حادثۂ عظیم کے بعد ۱۹۷۵ء سے بھٹو صاحب، حفیظ پیرزادہ اور واپڈا کے چیئرمین اس ڈیم سے براہ راست متعلق رہے ہیں۔ اس ٹیم کی نگرانی میں جتنی مرمتیں ہوئیں سب ناکام اور ناکارہ ثابت ہوئیں، مذکورہ تینوں افراد کے علاوہ وزارت ایندھن اور قدرتی وسائل کے ایک ایڈیشنل سیکرٹری کا بھی اس سے

براہ راست تعلق رہا۔ یہ ڈیم پیہم کسی نہ کسی حادثہ کا شکار ہوتا رہا ہے۔

پاکستان کے دونیم ہو جانے کے عظیم المیہ کے بعد تربیلا کی تباہی، دوسرا سب سے بڑا حادثہ ہے۔

تیس سال کی پاکستان کی تاریخ میں حکمرانوں کے مواخذہ اور احتساب کا مؤثر انتظام نہ ہونے کی وجہ سے بڑے بڑے گھناؤنے اسکینڈل منظر عام پر نہ آسکے اور حکمران صاف بچ کر نکل گئے، تاہم قومی زندگی کے جس تاریخی اور نازک دور سے اس وقت ہم گزر رہے ہیں اس کا بنیادی اور اہم تقاضا یہ ہے کہ حکمرانوں کے قومی جرائم سے ہرگز تغافل اور صرفِ نظر نہ کیا جائے، بلکہ سنگین قومی جرائم کے مرتکبین کو عبرتناک سزائیں دی جائیں۔

اس عظیم منصوبہ آب رسانی کو سب سے پہلا حادثہ ۲۷ رجولائی ۱۹۷۴ء کو پیش آیا جب سرنگ نمبر ۲ کا آہنی دروازہ کوشش بسیار کے باوجود بند نہ ہو سکا جب اس کو بند کرنے کی زبردستی کوشش کی گئی تو نزدیک کے ایک پہاڑ ہندوکش میں بھونچال آگیا۔ —— پھر کچھ دن گزرنے کے بعد اس سرنگ سے مٹی نکلنے لگی۔ اس طرح سرنگ نمبر ایک کے دروازے بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے ۱۳۰ راگست ۷۴ء کو سرنگ نمبر ۲ کے نیچے دھماکہ سنا گیا تحقیق کرنے پر پتہ چلا کہ سرنگ کے اندر کی فولادی چادر اپنی جگہ سے اکھڑ گئی ہے۔ اس طرح سرنگ نمبر ۳ اور چار سے مزید دھماکے سنے گئے اور سرنگ نمبر تین میں پانی کے اخراج کی مقدار اچانک ہی حد سے بڑھ گئی۔

آبی ذخیرہ کم ہونے پر ۲۰ ر ستمبر کو معائنہ کرنے پر راز منکشف ہوا کہ سرنگ نمبر دو تقریباً ڈھائی سو فٹ چوڑے شگاف کی وجہ سے کھائی کی شکل اختیار کر چکی ہے — اور اس ڈھائی سو فٹ شگاف کی وجہ سے سرنگ نمبر تین کے فرش اور دیواروں کے ساتھ فولادی چادر کٹی جگہ سے اکھڑ گئی تھی، اسی طرح سرنگ نمبر تین اور چار کے سٹلنگ بیسن میں جہاں پر پانی باہر آکر گرتا ہے، بری طرح سے ناکارہ ہو گئے ہیں۔ ان میں گہرے کھڈ پڑ گئے اور بقیہ سرنگوں کا استعمال ناممکن ہو گیا اور آبی ذخیرہ کی تہہ میں جگہ جگہ سوراخ پڑ گئے۔

تربیلا کے اس سانحہ عظیم کی وجہ سے فصلوں کو بروقت پانی فراہم نہیں کیا جا سکا اور گندم اور چاول کی فصلوں کو زبردست نقصان پہنچا اور متوقع پیداوار حاصل نہ ہو سکی۔ اس طرح صرف گندم کی پیداوار میں پندرہ لاکھ ٹن کمی واقع ہو گئی۔ جس کی بین الاقوامی مارکیٹ میں قیمت کم از کم تین ارب روپیہ بنتی ہے جو پاکستان کو قیمتی زرِ مبادلہ کی صورت میں خرچ کرنی پڑی۔

ماہرین کے محتاط اندازہ کے مطابق اس اضافی — مرمت پر ایک ارب روپیہ کا کثیر اور قیمتی سرمایہ خرچ ہوا۔ بجلی کی قلت کی وجہ سے صنعتی اور زرعی شعبوں میں زبردست مالی خسارہ ہوا، وفاقی نگران ٹیم نے ٹھیکیدار سے بے پناہ مالی فوائد حاصل کئے۔ ڈیم کی موجودہ حالت بھی تسلی بخش نہیں ہے، سرنگ نمبر چار صحیح کام نہیں کر رہی ہے اور ۵۵ کروڑ روپیہ مزید خرچ کر کے اس کا ڈیزائن تبدیل کیا جائے گا۔ ابتدائی تخمینہ قصداً کم کر کے دکھایا گیا ہے۔ بعد میں یہ خرچ ایک ارب روپیہ تک پہنچ جائے گا، یہ کروڑوں روپیہ کا خرچ محض نااہلی اور سنگین بدعنوانیوں کی وجہ سے قوم کو برداشت کرنا پڑا۔ ڈیم کی سرنگ نمبر تین بھی غالباً آب پاشی کی سرنگ نہیں رہے گی، بلکہ بجلی کے لیے استعمال ہو گی۔ اس کی حالیہ مرمت کا بھی فی الحال خاطر خواہ ٹیسٹ نہیں ہو سکا اور نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مرمت بھی کارگر اور پائیدار ثابت ہو سکے گی یا نہیں۔

اب تک ڈیم ۱۵۱۲ فٹ تک بھرا گیا ہے جب کہ اس کی پوری اونچائی ۱۵۵۰ فٹ تک ہے، اس طرح واپڈا کا حالیہ دعویٰ باطل ثابت ہو جاتا ہے کہ ڈیم مقررہ گنجائش پر چل رہا ہے۔ پانی سرنگ نمبر پانچ اور سپل وے سے ملا ہوا ہے نہ کہ سرنگ نمبر تین اور چار سے، مؤخر الذکر صرف تھوڑے دنوں کے لیے آزمائشی طور پر کھولا گیا اور پھر فوری طور پر بند کر دیا گیا۔

اب تک سرنگوں کی مرمت غیر ملکی ٹھیکیداروں سے کرائی گئی ہے، حالانکہ شنید ہے کہ ایک پاکستانی کمپنی نے اس کی مرمت کرنے کا ذمہ لیا تھا لیکن وہ "حسب منشا" کمیشن نہ دے سکتی تھی اس لیے اس کو یہ کام نہیں دیا گیا۔

تربیلا کا عظیم قومی المیہ پاکستان کی اقتصادیات اور زرعی و صنعتی شعبوں کو دیمک کی طرح چاٹ گیا ہے لہٰذا مارشل لاء انتظامیہ کو تطہیر کا دائرہ وسیع کر کے تربیلا کو بھی اس میں شامل کرنا چاہیئے اور تربیلا جو سنگین بدعنوانیوں اور اربوں روپیہ کی خورد برد کی آماجگاہ بنا ہوا ہے اس کے معاملات اور تکمیل میں تاخیر کے اسباب کا محاسبہ اور مواخذہ کرنا چاہیئے اور قومی معیشت کو نقصان پہنچانے والے چہروں پر سے جلد از جلد نقاب اٹھانا چاہیئے۔

ڈیم میں حالیہ نقص دور کرنے پر ایک ارب روپیہ کی خطیر رقم دیگر سابقہ مرمتوں پر خرچ ہونے والی رقموں میں شامل کر لی جائے تو مجموعی رقم کا تخمینہ صرف مرمت پر دو ارب ستر کروڑ ہو جاتا ہے۔

کیا یہ سارے معاملات ایسے نہیں کہ ان کا تدارک کیا جائے۔ اور کیا محاسبے کا عمل صرف سیاستدانوں تک محدود رہنا چاہیئے، پاکستان کو لوٹ کر کھا جانے والوں پر اس کی گرفت کب ہو گی؟

ضیا شاہد ، اختر کاشمیری

اس مضمون میں آپ ایسی بہت سی باتیں پڑھیں گے جو آپ کے لیے بالکل نئی ہوں گی۔

قتل۔ قاتل۔ مقتول

پاکستان میں رائج برطانوی قانون — اور اسلام کا موازنہ

عام زندگی میں کسی انسان کو قتل کرنا سب سے بھیانک جرم سمجھا جاتا ہے اور یہ واحد جرم ہے جس کی سزا اکثر و بیشتر معاشروں اور مذاہب میں موت ہے۔ دنیا میں سب سے پہلا قتل جس کا انسانی تاریخ سے سراغ ملتا ہے، حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹے ہابیل کا قتل ہے، جسے اس کے بھائی قابیل نے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ اس وقت سے آج تک ہر بستی اور ریاست میں اس جرم کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی مگر اپنے بھائی کا خون بہانا شاید انسانی فطرت کا ایک حصہ ہے، لہذا میدانِ جنگ میں مخالف لشکروں کے مابین جو خون ریزی ہوتی ہے اور جسے ہم اجتماعی قتل کا نام دے سکتے ہیں اس سے قطع نظر انفرادی طور پر بھی قتل کے جرم پر قابو نہیں پایا جا سکا اور ہمارے چاروں طرف آج بھی آئے دن قتل کے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ جب معاشرے میں اعلیٰ اقدار کارفرما ہوں تو ان کی تعداد میں اچھی خاصی حد تک کمی واقع ہو جاتی ہے اور بدامنی، توڑ پھوڑ اور منفی اقدار کے دور میں قتل کی شرح میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ آیئے یہ دیکھیں کہ پاکستان میں قتل کی کیا سزا ہے اور یہ اسلام میں قتل کی سزا سے کس حد تک مختلف ہے۔

قتل کی سزا پاکستان میں

وطنِ عزیز میں اب تک قتل کے سلسلے میں برطانوی قانون رائج ہے۔ یہ وہی قانون ہے جو برصغیر پر برطانوی حکومت کے دورِ حکومت میں برطانوی ہند کے لیے بنایا گیا اور اسے "تعزیراتِ ہند" کہا جاتا تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد اسے تعزیراتِ پاکستان کا نام دیا گیا۔ اس وقت بھی "پرسنل لاز" صرف شادی، طلاق اور جائیداد و وراثت وغیرہ پر لاگو ہوتا تھا اور اس ضمن میں ہر مذہب کے متعلقہ افراد کے ذاتی معاملات ان کے مذہبی قانون کے مطابق دیکھے جاتے تھے۔ قتل کی سزا اور قانون ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی سب کے لیے یکساں تھے اور اس کا ڈھانچہ وہی تھا جو آج بھی برطانیہ میں نافذ العمل ہے۔

قانونِ قتل کی دفعات

عام طور پر پاکستان میں قتل کے سلسلے میں قانون کی تین چار دفعات استعمال کی جاتی ہیں۔

مثال کے طور پر پاکستان کے سابق وزیر اعظم مسٹر بھٹو پر قتل کا جو مقدمہ چلایا گیا اور جسے لاہور ہائیکورٹ کے فل بنچ نے سنا، اس میں ملزم کے خلاف دفعات ۳۰۲ / ۱۰۹ / اور ۱۲۰ بی عائد کی گئی تھیں۔

۳۰۲ کی دفعہ ان ملزموں پر عائد کی جاتی ہے جن کے خلاف یہ الزام عائد ہو کہ انہوں نے کسی شخص کو قتل کرنے کی نیت سے مارا اور وہ شخص ہلاک ہو گیا۔

۱۰۹ کا اطلاق ان ملزموں پر ہوتا ہے جنہوں نے کسی کو قتل پر اکسایا ہو۔

دفعہ ۱۲۰ بی، قتل کی سازش میں ملوث ہونے

والوں پر لاگو کی جاتی ہے۔

قتل کے سلسلے میں ایک دفعہ ۳۰۷ بھی ہے۔ یہ ان ملزموں پر عائد کی جاتی ہے، جنہوں نے کسی شخص پر قتل کی نیت سے حملہ کیا ہو، مگر وہ شخص مرنے سے بچ گیا ہو۔

قتل کی سزا

مندرجہ بالا سطور میں ہم نے جو تین دفعات بیان کیں، ان میں سے دفعہ ۳۰۲ کی زیادہ سے زیادہ سزا موت یا عمر قید ہے، البتہ یہ بات جج کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ مخصوص حالات کے مطابق اس سزا میں کمی کر سکتا ہے۔

مثال کے طور پر جو اسباب سزا میں کمی کا باعث ہوتے ہیں، ان میں سے چند ایک یہ ہیں:-

۱۔ قاتل کی عمر کم ہو۔

۲۔ قاتل بوڑھا اور معمر ہو۔

۳۔ اس نے غصے یا اشتعال میں آکر ارتکاب جرم کیا ہو، وغیرہ۔

دفعہ ۱۰۹ یعنی قتل پر اکسانے کی بھی وہی سزا ہے جو دفعہ ۳۰۲ کی ہے۔

۱۲۰۔ بی یعنی قتل کی سازش کرنے کی سزا بھی مندرجہ بالا دونوں دفعات کے مطابق ہے۔

قاتل کی گرفتاری کا طریقہ

پاکستان میں رائج قانون کے مطابق پولیس قاتل کو گرفتار کرنے کے لیے ۱۵۴ ضابطہ فوجداری کے تحت تفتیش کا آغاز کرتی ہے اور ملزم کو کسی عدالت میں پیش کر کے اس کا ریمانڈ حاصل کرتی ہے۔ ریمانڈ سے مراد یہ ہے کہ پولیس کو وہ شخص جسمانی طور پر مطلوب ہے۔

ریمانڈ زیادہ سے زیادہ چودہ دن کا ہوتا ہے۔ عام طور پر پولیس کم دنوں کا ریمانڈ لیتی ہے اور بعد ازاں اس میں اضافہ کر کے چودہ دن پورے کرتی ہے۔ یہ سہولت اس لیے ہے کہ چودہ دن کے بعد ملزم کو جوڈیشل افسروں کے سپرد کرنا پڑتا ہے جو اسے حوالاتی حیثیت سے باقاعدہ طور پر جیل بھیج دیتے ہیں، جہاں پولیس افسروں کے لیے ان سے تفتیش کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ قارئین کو گذشتہ دنوں کراچی میں رونما ہونے والے ترنم کیس کا حوالہ یاد ہو گا، جس میں یہ بحث چل نکلی تھی کہ قتل کے ملزموں کو کسی عدالت سے ریمانڈ کے بغیر پولیس نے اپنے پاس رکھا ہے اور بعد میں پولیس نے یہ وضاحت کی تھی کہ یہ الزام غلط ہے اور ان کا باقاعدہ ریمانڈ حاصل کیا گیا تھا۔

ریمانڈ اور تفتیش

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، تفتیش کے لیے زیادہ سے زیادہ چودہ دن ملتے ہیں اور اسی دوران ہی پولیس کو چالان مکمل کرنا پڑتا ہے، یہی وہ مرحلہ ہے جس میں بالعموم پولیس کے بارے میں یہ شکایت کی جاتی ہے کہ وہ ملزموں کو تشدد کے ذریعے اقبال جرم پر مجبور کرتی ہے۔

قانونی طور پر پولیس کو تشدد کا کوئی حق نہیں، لیکن یہ ایسی لاقانونیت ہے جو "غلط العام" بن چکی ہے اور اب اس پر کسی خاص حیرت کا اظہار نہیں کیا جاتا اور نہ متعلقہ محکمے اور حکام اس کا کوئی خاص نوٹس لیتے ہیں۔ ترنم کیس ہی کو دیکھیے جس کے ملزموں نے برف کی سلوں پر لٹائے جانے اور ناخن کھینچے جانے تک کی شکایات کی ہیں۔

بہرحال تفتیش کا مرحلہ ہی بالعموم سب سے تکلیف دہ ہوتا ہے کیونکہ پولیس کے اختیارات بے شمار ہیں اور بعد میں ملزم جو بھی کہتا رہے پولیس افسر چاہے تو ایک بار اس کی چمڑی ادھیڑ دیتا ہے۔ قتل کے اکثر واقعات میں رشوت اور سفارش بھی سب سے زیادہ اسی مرحلے پر اثر انداز ہوتی ہے، کیونکہ اکثر ملزموں کی کوشش ہوتی ہے کہ پولیس کی مار سے بچنے کے لیے وہ کچھ نذرانہ پیش کر سکیں۔ یہ نذرانہ اکثر اوقات قبول کر لیا جاتا ہے۔

قتل کے اکثر ملزموں سے جو حوالاتی کی حیثیت سے جیلوں میں بند ہیں اور جن کے مقدمے مختلف عدالتوں میں ہیں، انٹرویو کرنے سے یہ پتہ چلا کہ دوران تفتیش رشوت یا سفارش نہ ہو تو چودہ دن چودہ سال سے بھی طویل لگتے ہیں۔

قانونی حلقوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس مرحلے میں پولیس چالان تیار کرتے وقت بعض اوقات رشوت لے کر یا سفارش سے کوئی ایسا جھول رکھ دیتی ہے، جن کا فائدہ آگے چل کر قاتل کو مل جاتا ہے اور اس کی وجہ سے بچ نکلتا ہے یا کم سزا پاتا ہے۔ قتل کے سو فیصد ملزموں کا یہ کہنا ہے کہ جوڈیشل لاک اپ یعنی جیلیں دوران ریمانڈ پولیس کی حوالاتوں سے لاکھ درجہ بہتر ہیں بلکہ اکثر ملزم تو یہ کوشش کرتے ہیں کہ جس قدر جلد ممکن ہو پولیس ان کا چالان مکمل کر دے اور انہیں جیل بھیج دیا جائے جہاں وہ پولیس کے بجائے عدالت اور جیل حکام کے مہمان ہوتے ہیں۔ واضح رہے کہ ملک بھر کی جیلوں میں دو قسم کے افراد ہوتے ہیں، اول حوالاتی یعنی وہ ملزم جن کے مقدمات عدالتوں میں زیر سماعت ہوں۔ دوم قیدی یعنی وہ ملزم جنہیں کسی عدالت نے سزا سنا دی ہو، انہیں قانون کی اصطلاح میں ملزم نہیں مجرم کہا جاتا ہے۔ چھوٹی عدالتوں سے سزا پانے والے ملزم بھی مجرم ہوتے ہیں، خواہ انہوں نے اسی عدالت کے فیصلے کے خلاف اپیل ہی کیوں نہ دائر کر رکھی ہو۔

قتل کیس کی کارروائی

پولیس ریمانڈ کے چودہ روز میں قتل کے ملزم کا چالان مکمل کر کے اسے علاقہ مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کرتی ہے۔ وہ ان کاغذات کو دیکھ کر یہ رائے دیتا ہے کہ کیا مقدمہ سیشن جج کی عدالت میں بھیجے جانے کے قابل ہے۔ یہ کام وہ پہلی ہی تاریخ میں کر کے ملزم کو جیل بھیج دیتا ہے۔

سیشن کورٹ میں

مقدمۂ قتل کی اصل کارروائی سیشن جج کے سامنے شروع ہوتی ہے۔ سیشن جج ہی ایسے ملزم کی ضمانت لے سکتا ہے، بشرطیکہ اسے اس امر کا یقین ہو کہ ملزم کے خلاف مواد کافی نہیں۔ بصورت دیگر ملزم جیل میں رہتا ہے اور مقدمہ چلتا رہتا ہے۔ قانون میں ایسی کوئی گنجائش نہیں کہ یہ مقدمہ کتنے عرصہ میں مکمل ہو جانا چاہیے۔ بعض اوقات تو کئی برس لگ جاتے ہیں، لیکن بالعموم ایسے کیس ایک سال سے دو سال تک مکمل ہو جاتے ہیں۔ اگر اس سے زیادہ مدت مقدمہ جاری رہے تو ملزم ضمانت کا حق دار بھی سمجھا جاتا ہے۔ تفتیش کے ابتدائی مرحلے میں بعض اوقات پولیس بھی ان ملزموں کی ضمانت لے سکتی ہے، جن کے بارے میں یقین ہو کہ وہ بے گناہ ہیں یا ان کے خلاف تسلی بخش مواد موجود نہ ہو۔ علاوہ ازیں قانون میں یہ صراحت بھی موجود ہے کہ اگر ملزم کے عزیز اور رشتہ دار یہ سمجھیں کہ پولیس کی تفتیش ان کے خیال میں تسلی بخش نہیں تو وہ درخواست دے کر پولیس کی دوسری برانچ سے بھی تفتیش کروا سکتے ہیں۔

جیلوں کا ایندھن

پاکستان کی تمام جیلوں میں سب سے زیادہ تعداد میں قتل کے ملزم اور مجرم موجود ہیں۔ اس قانون میں بعض بنیادی نقائص کے تحت مقدمے کا فیصلہ ہونے تک یعنی سیشن سے سپریم کورٹ تک تقریباً تین چار برس کا عرصہ لے جاتا ہے۔ ملزم کو جیل میں رکھنا پڑتا ہے، اس کے بعد خواہ وہ بے گناہ قرار پا کر رہا ہی کیوں نہ ہو جائے، عام طور پر مقتول کے عزیز و اقرباء یا پولیس اصل ملزم کے ساتھ متعدد دوسرے افراد کو بھی سازش تیار کرنے یا اکسانے کے الزام میں

گرفتار کروادیتے ہیں۔ ان میں سے بعض سیشن کورٹ سے ضمانت پر رہا ہو جاتے ہیں، لیکن متعدد واقعات میں یہ بے گناہ لوگ بھی اصل قاتل کے ساتھ کئی کئی برس جیلوں میں رہتے ہیں۔

ہائیکورٹ میں

سیشن کورٹ سے ملزم کے مقدمے کا فیصلہ ہونے کے بعد اس وقت تک عملدرآمد نہیں ہوتا جب تک ہائیکورٹ اس کی توثیق نہ کردے، چنانچہ سیشن جج فیصلہ سنانے کے بعد تصدیق کے لیے ہائی کورٹ کو فائل بھیج دیتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ملزم کو یہ حق دیا جاتا ہے کہ وہ اس فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل کرسکتا ہے۔

عام طور پر ملزم جو اپیل کرے اسے تصدیق کیلیے آنے والے ریفرنس کے ساتھ ہی ہائی کورٹ کے کسی جج کے سامنے پیش کر دیا جاتا ہے۔

ہائیکورٹ کے بعد

اگر کسی ملزم کو ہائی کورٹ سے بھی رہائی نہ ملے، ہائیکورٹ، سیشن کورٹ کے فیصلے کی توثیق کردے تو ملزم سپریم کورٹ سے اپیل کی خصوصی درخواست کی اجازت لیتا ہے، جو کاغذات کے مطالعے کی بنیاد پر ملتی ہے۔ واضح رہے کہ ملزم سیشن کورٹ تک مقدمے کی کارروائی میں پیش کیا جاتا ہے، بعد ازاں صرف اس کا وکیل اور سیشن جج کے فیصلے کے کاغذات فائل کی حیثیت میں پیش ہوتے ہیں، البتہ اگر ملزم کا وکیل چاہے تو عدالت کی خصوصی اجازت ملنے پر ملزم کو جیل سے ایک آدھ بار ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ میں پیش کرسکتا ہے۔ یہ اجازت اس صورت میں دی جاتی ہے کہ ملزم کی عمر وغیرہ کی تصدیق کے لیے ذاتی حاضری ضروری ہو۔

سپریم کورٹ میں بھی ملزم کا وکیل ہی پیش ہوتا ہے۔ یہاں ریکارڈ اور سابقہ فیصلوں کی بنیاد پر مقدمہ چلتا ہے۔ اگر سپریم کورٹ بھی سزا کو بحال رکھے اور ملزم بری نہ ہوسکے تو اس کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہوتا کہ وہ رحم کی اپیل کرے۔

رحم کی دو اپیلیں

قتل کا ملزم سپریم کورٹ سے بھی مایوس ہوکر رحم کی دو اپیلیں کرسکتا ہے۔ پہلی اپیل گورنر سے ہوتی ہے اور دوسری صدر مملکت سے۔ یہ دونوں اپیلیں ہوم ڈیپارٹمنٹ کے توسط سے کی جاتی ہیں اور اس میں بنیاد بالعموم یہ ہوتی ہے کہ ملزم کم عمر یا زیادہ عمر کا ہے یا خاندان کا واحد سہارا ہے یا اس کی مقتول کے خاندان سے پرانی دشمنی چلی آرہی تھی وغیرہ۔

رحم کی اپیل منظور کرتے ہوئے ملزم کی سزا کم بھی کی جاسکتی ہے اور معاف بھی۔

قاتل قیدی

اگر قتل کے ملزم کو پھانسی کی سزا نہ ہو یا سزا تو ہو، لیکن رحم کی اپیل کے تحت عمر قید میں تبدیل کردی جائے یا اس سے بھی گھٹا دی جائے تو وہ جیل میں اپنی سزا کا وقت پورا کرتا ہے۔ اس دوران میں بھی بعض اوقات اس کی سزا میں تخفیف ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر بعض خوشی کے موقعوں یا حکومت کی تبدیلی وغیرہ کے وقت سزائے موت کی معافی کے احکام بھی آجاتے ہیں اور بعض دفعہ سزاؤں میں تخفیف بھی ہو جاتی ہے۔

عمر قید کی تعریف

قتل کے جن ملزموں کو عمر قید کی سزا سنائی جاتی ہے، اس کا یہ مقصد نہیں ہوتا کہ وہ جب تک زندہ ہیں، جیل میں رہیں گے۔ عمر قید ایک اصطلاح ہے جس میں سزا کی مدت پہلے چودہ برس تھی۔ ... لیکن مسٹر بھٹو کے دورِ حکومت میں میاں محمود علی قصوری نے جو اس وقت وزیر قانون تھے، یہ مدت چودہ سال سے بڑھا کر بیس سال کردی تھی، کیونکہ ان کا مؤقف تھا کہ چودہ برس کی سزا پانے والے لوگ بالعموم سات آٹھ برس بعد رہا ہو جاتے ہیں، کیونکہ قید کے دوران انہیں اچھے چال چلن، جیل میں مزدوری، تعلیم حاصل کرنے کے انعام وغیرہ کے سلسلے میں چھوٹ ملتی رہتی ہے اور مخصوص دنوں پر بھی حکومت قیدیوں کی سزائیں معاف کرتی رہتی ہے، لہٰذا اس مدت کو بڑھانا چاہیے۔

آج کل عمر قید بیس برس ہے جو اندازاً بارہ تیرہ کے لگ بھگ ہوتی ہے اور باقی مدّت معافی میں کٹ جاتی ہے۔

براہ راست ہائیکورٹ میں

اوپر ہم نے قتل کے ملزم کی گرفتاری اور مقدمے کا طریق بیان کیا۔ بسا اوقات اس سے انحراف بھی کیا جاتا ہے، جس کی قانون میں گنجائش موجود ہے۔ مثال کے طور پر کسی مقدمے کی کارروائی سیشن کورٹ میں شروع کرنے کی بجائے ہائی کورٹ براہ راست سماعت شروع کرسکتا ہے۔ اکثر اہم مقدمات میں ایسی مثالیں پائی گئی ہیں۔ موجودہ دور میں مسٹر بھٹو کے خلاف مقدمۂ قتل بھی اس کی ایک مثال ہے۔ نواب احمد خان کے قتل کے الزام میں مسٹر بھٹو اور دیگر ملزموں کے مقدمے کی سماعت کسی سیشن جج کے سامنے نہیں، بلکہ ہائی کورٹ کے فل بنچ کے روبرو ہوئی۔ ملک امیر محمد خان کے قتل کا مقدمہ بھی ہائیکورٹ میں چلا تھا۔

اسلامی قانون اور موجودہ پاکستانی قانون

اسلام کے مطابق قاتل کی سزا حسب ذیل ہے:۔

(۱) اسے موت کی سزا دی جائے۔

(۲) اگر مقتول کے ورثا راضی ہوں تو قاتل سے قصاص یعنی خون بہا کے طور پر نقد رقم لے سکتے ہیں۔

(۳) اگر مقتول کے وارث چاہیں تو قاتل کو معاف بھی کرسکتے ہیں۔ اسلامی قانون میں عدالت یا حکومت اس بارے میں کوئی مداخلت نہیں کرتی، بلکہ خون بہا اور معافی کے سلسلے میں اصل اختیار مقتولوں کے وارثوں کو ہے۔

دوسرے لفظوں میں اسلامی قانون اور پاکستان میں رائج برطانوی طرز کے قانون میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اسلام میں قتل قابلِ راضی نامہ جرم ہے جس میں فریقین چاہیں تو صلح کرسکتے ہیں، جبکہ برطانوی قانون میں مقتول کے وارثوں کو ایسا کوئی حق نہیں اور اس میں معافی کا فیصلہ بھی ریاست کے ہاتھ میں ہے۔ اگر مقتول کے وارث نہ چاہیں تو بھی قتل کا مقدمہ محض خبر ملنے پر درج کرلیا جاتا ہے۔

اسلام میں جیل کا تصور نہیں

اسلام میں اس اعتبار سے جیل کا تصور نہیں کہ اس میں لمبی مدت کے لیے قید کا حکم نہیں سنایا جاتا۔ جب تک فیصلہ نہ ہو اس وقت تک ملزم کی گرفتاری ضروری ہو تو اسے حوالات میں ضرور رکھا جاتا ہے، لیکن عمر قید یا دس بیس برس کی سزا کا تصور ہی اسلامی قانون میں موجود نہیں اور یہ ایک اعتبار سے افضل چیز ہے، کیونکہ طویل سزا کی صورت میں اصل سزا ملزم کو ہی نہیں، بلکہ اس کے عزیز و اقارب کو بھگتنا پڑتی ہے۔ اسلام میں صاف طور پر یہ وضاحت موجود ہے کہ اگر مقتول کے وارث اسے معاف کرنے یا خون بہا لینے پر راضی نہ ہوں اور اس پر قتل کا الزام ثابت ہو جائے تو اسے قتل کردیا

مسٹر بھٹو کے زمانے میں عمر قید کی سزا ۱۴ سال سے بڑھا کر بیس سال کر دی گئی

جائے۔

قانونِ شہادت

تیسرا فرق قانونِ شہادت کا ہے۔ تفصیلات میں جائے بغیر یہاں یہ کہنا کافی ہوگا کہ اسلامی قانون میں ایک عورت کی گواہی کافی نہیں، بلکہ کم از کم دو عورتوں کی گواہی مل کر ایک گواہی شمار کی جاتی ہے، جبکہ برطانوی قانون میں جو ہمارے ہاں رائج ہے، ایک عورت کی گواہی پر بھی سزا دی جا سکتی ہے۔ علاوہ ازیں اسلام میں واقعاتی شہادت یا تائیدی شہادت کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ واقعاتی شہادت سے مراد یہ ہے کہ چشم دید گواہ کوئی نہ ہو، لیکن حالات ثابت کرتے ہوں کہ قاتل فلاں ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ کوئی شخص اس حالت میں پکڑا جائے کہ خون آلود چاقو اس کے پاس ہو اور اس کی نشاندہی پر لاش بھی برآمد ہو جائے۔ ایسی صورت میں اگرچہ چشم دید گواہ کوئی نہ تھا، لیکن حالات نے گواہی دی کہ فلاں شخص ملزم ہے۔ اسی طرح ایک اور مثال دیکھیے کہ ایک شخص خنجر لہراتے ہوئے مقتول کے مقام کی طرف جاتے ہوئے دیکھا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اسے واپس بھاگتے ہوئے دیکھا گیا۔ مقتول کی موت بھی اسی دوران ہوئی اور آلۂ قتل بھی خنجر نما ہے لہٰذا صرف اس گواہی پر کہ ملزم مقتول کی طرف گیا اور واپس آیا یا بھاگ گیا، بقیہ گواہی حالات سے لی جا سکتی ہے۔

واقعاتی شہادت میں غلطی کا امکان

جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا، اسلام میں واقعاتی یا تائیدی شہادت کو قبول نہیں کیا جاتا، لیکن پاکستان میں رائج برطانوی طرز کے قانون میں اس شہادت کو تسلیم کرتے ہیں۔ ایک عرصے تک برطانوی عدالتیں بھی اس امر کے حق میں رہیں کہ واقعات جھوٹ نہیں بولتے اور چشم دید گواہ کی طرح حالات و واقعات کی گواہی بھی مستند سمجھی جانی چاہیے، لیکن چند مقدمے ایسے سامنے آئے جنہوں نے یہ ثابت کر دیا کہ اسلامی قانون کا یہ تقاضا درست تھا کہ حالات و واقعات بعض اوقات جھوٹے نتائج تک پہنچاتے ہیں۔

چھری، قاتل اور مقتول

اس سلسلے میں برطانوی عدالتوں کے سامنے ایک بہت مشہور کیس آیا، جس کے حالات و واقعات انتہائی دلچسپ تھے: ایک شخص دو کوارٹروں میں سے جو بالکل ساتھ ساتھ تھے اور جن کے درمیان صرف ایک دیوار تھی، اپنے کوارٹر کے صحن میں چارپائی پر لیٹا اخبار پڑھ رہا تھا کہ کسی نے تیزی سے چھری اس کی طرف پھینکی اور دل میں اتر گئی۔ اس کے پڑوسی کو قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا جس نے تسلیم کیا کہ وہ قتل کے وقت اپنے گھر میں موجود تھا۔ اس نے ساتھ والے کوارٹر سے چیخ سنی۔ وہ دیوار پھاند کر پڑوس کے کوارٹر میں گیا تو زخمی دم توڑ چکا تھا اور چھری اس کے دل میں ترازو ہو چکی تھی۔ گھر میں اور کوئی شخص موجود نہ تھا اور دروازہ بھی اندر سے بند تھا۔ اس پر وہ دوبارہ دیوار پھاند کر گھر آیا اور پھر پولیس کو اطلاع کر دی۔

مقدمہ چلا اور عدالت نے اس شخص کو اپنے پڑوسی کا قاتل قرار دیا، کیونکہ حالات و واقعات اس کے خلاف گواہی دیتے تھے۔ اخباروں میں اس قتل کی روداد اور فیصلہ شائع ہوا اور اس چھری کی تصویر اور تفصیلات بھی ـــ جس سے قتل کیا گیا تھا تو حالات نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا اور یہ مقدمہ ملک بھر کے عوام کی دلچسپی کا مرکز بن گیا۔

چھری میری تھی

ایک شخص جو اسی شہر میں رہتا تھا، پولیس افسروں کے پاس آیا اور اس نے بیان دیا کہ جس چھری سے قتل ہوا وہ اس کی ہے۔ پوچھا گیا کہ پھر یہ قاتل کے ہاتھ میں کیسے پہنچی؟ اس شخص نے جواب دیا کہ میں زندگی بھر قاتل یا مقتول میں کسی کو ملا ہوں نہ میرا ان سے کسی قسم کا تعلق ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ میں نے ایک مرغی ذبح کی اور کوئی برتن لینے کے لیے کمرے میں آیا۔ واپس صحن کی طرف جا رہا تھا کہ میری آنکھوں کے سامنے ایک بڑی سی چیل نے ذبح کی ہوئی مرغی پر جھپٹا مارا۔ مرغی تو اس کے ہاتھ نہ آئی، البتہ چھری پنجوں میں دبا کر چیل اڑ گئی۔

واقعات کچھ، اصل قصہ کچھ

پولیس نے تحقیقات کے بعد اس شخص کو سچا قرار دیا اور مزید تفتیش اور جائے واردات سے ملنے والے کچھ نشانات کے باعث یہ نتیجہ اخذ کیا کہ بظاہر جس قدر واقعات سامنے آئے وہ ایک بے گناہ کو قتل کا ملزم قرار دے رہے تھے، جبکہ اصل قصہ مختلف تھا۔ چیل یہ چھری پنجوں میں دبائے کچھ دور تک اڑی اور اتفاق سے اس گھر کے صحن پر سے گزر رہی تھی کہ چھری پنجوں سے پھسل کر نیچے گر پڑی۔ مقتول سیدھا لیٹ کر اخبار پڑھ رہا تھا کہ اوپر سے چھری آئی اور اس کے دل میں اتر گئی۔ لاش کے پاس ملنے والے کچھ پروں اور چھری پر چند بالوں کے نشانات اور آثار نے بھی اس کی تصدیق کی، چنانچہ ملزم کو بے گناہ قرار دے کر رہا کر دیا گیا۔

وعدہ معاف گواہ

جب کسی قتل میں ایک سے زائد ملزم ہوں مگر پولیس تفتیش سے ٹھوس نتائج برآمد نہ ہوں، چشم دید گواہ نہ ہوں یا استغاثہ کو کافی مواد نہ ملا ہو تو بالعموم پولیس کوشش کرتی ہے کہ ملزموں میں سے کوئی ایک وعدہ معاف گواہ بن جائے۔ وعدہ معاف گواہ یہ تسلیم کرتا ہے کہ وہ خود قتل میں شامل تھا، البتہ اس کے ساتھ فلاں فلاں افراد بھی تھے اور صحیح واقعات یہ ہیں۔

وعدہ معاف گواہ کو بھی ملزموں کے ساتھ سزا دی جاتی ہے، لیکن اس کی سزا پر عمل درآمد نہیں ہوتا اور اسے معاف کر کے رہا کر دیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں صرف وعدہ معاف گواہ کا بیان کافی نہیں ہوتا، بلکہ اس بیان کی دیگر حقائق سے تصدیق ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ ادھر ملزموں کے وکیل کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ وعدہ معاف گواہ کو جھوٹا اور اپنے مطلب کے لیے پولیس کے بیان کی تصدیق کرنے والا قرار دیں۔ اس سلسلے میں اس کے سابقہ چال چلن کے بارے میں جرح کے دوران بری باتیں سامنے لائی جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں اگر ملزموں کے وکیل یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو جائیں کہ وعدہ معاف گواہ اپنے بیان سے پہلے دیر تک پولیس کی تحویل میں رہا یا بعد میں اسے کسی دوسرے مقدمے میں پولیس کی تحویل میں جانے کا خوف تھا اور اس نے یہ بیان پولیس کے دباؤ کے تحت اپنی جان بچانے کے لیے دیا ہے تو ملزموں کے خلاف مقدمہ کمزور پڑ جاتا ہے۔

عام طور پر وعدہ معاف گواہ پر لمبی جرح کی جاتی ہے۔ حال ہی میں مسٹر بھٹو کے خلاف مقدمۂ قتل کے وعدہ معاف گواہ مسٹر مسعود محمود پر طویل جرح اس کی ایک نمایاں مثال ہے۔ ان کا بیان اور بعد میں جرح کئی ہفتے تک ملک کے اخبارات میں شائع ہوتی رہی۔

اسلامی قانون میں سزا

اسلامی قانون کے مطابق قتل کی پانچ اقسام ہیں:

(۱) قتلِ عمد
(۲) قتل شبیہ العمد
(۳) قتل الخطاء
(۴) قتل قائمقام الخطاء
(۵) قتل بالسبب

قتلِ عمد سے مراد یہ ہے کہ قاتل کی نیت قتل کرنے کی ہو۔ اس کی سزا ہم پہلے بیان کر چکے ہیں یعنی موت، بشرطیکہ مقتول کے وارث قاتل کو معاف کرنے یا خون بہا لینے پر رضامند نہ ہوں۔ یہ بھی واضح رہے کہ اسلامی قانون کے مطابق معاف کرنے کا حق مقتول کے وارثوں کو ہے، نہ کہ ریاست کو۔

شبیہہ العمد سے مراد یہ ہے کہ مارنے کی نیت نہ ہو، لیکن قاتل کے ہتھیار یا ہاتھ سے کوئی مر جائے۔ اس کی سزا اسلامی قانون کے مطابق ابتدائی دور میں سو اونٹ جرمانہ ہوتا تھا جو ملزم کے غریب ہونے کی شکل میں تین برس تک ادا کیا جا سکتا تھا۔

قتل الخطاء سے مراد یہ ہے کہ ملزم غلطی سے خون کر بیٹھے۔ اس کی سزا ابتدائی دور میں یہ تھی کہ کسی غلام کو آزاد کرے یا دو ماہ تک روزے رکھے یا جرمانہ کی ایک رقم کی ادائگی کرے جسے عدالت ملزم کی غربت کی صورت میں تین برس میں قابلِ ادائیگی قرار دے سکتی ہے۔

قتل قائم مقام الخطاء سے مراد یہ ہے کہ اگرچہ قتل غلطی سے ہو، تاہم ملزم اس حد تک بے قصور ہو کہ اسے اس کا پتہ ہی نہ چلے۔ مثال کے طور پر ملزم نیند کی حالت میں چلتا ہوا کسی پر گر پڑے یا وہ ہوش میں نہ ہو اور اس کی کسی حرکت کی وجہ سے کوئی شخص جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اس کی سزا بھی قتل الخطاء کے مطابق جس میں عدالت کمی بیشی کر سکتی ہے۔

قتل بالسبب سے مراد یہ ہے کہ ملزم کا ارادہ تو قتل کا نہ تھا اور نہ مقتول سے لڑائی ہوئی، البتہ ملزم نے کوئی ایسا کام کیا جس سے کوئی بے گناہ شخص مارا گیا۔ مثلاً ملزم نے کسی راستے میں یا راستے سے ہٹ کر ایسا کنواں کھودا جس کے گرد دیوار نہیں بنائی یا وہ کسی کو دور سے نظر نہیں آیا۔ ملزم تو اس کام کے بعد گھر چلا گیا، لیکن کچھ دن، کچھ ہفتوں یا مہینوں کے بعد کوئی راہگیر یا دوسرا شخص غلطی سے اس کنویں میں گر پڑا اور جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اس قتل کی سزا عدالت کی صوابدید پر ہے۔ عام طور پر اس میں جرمانہ کی سزا دی جاتی ہے۔

پاکستان میں اسلامی قانون کا اعلان

گذشتہ دنوں جنرل ضیاءالحق صاحب نے یہ اعلان کیا کہ آئندہ پاکستان میں کوئی قانون جو اسلام کے خلاف ہے، ہائی کورٹ اسے کالعدم قرار دے سکتا ہے۔ اس اعلان کے سلسلے میں نیت کتنی ہی نیک کیوں نہ ہو، اس کا نتیجہ مثبت طور پر برآمد نہیں ہو سکا، کیونکہ یہ تو کہا گیا کہ غیر اسلامی قانون کو ہائی کورٹ کالعدم قرار دے سکے گا، لیکن یہ نہ بتایا گیا کہ جب یہ غیر اسلامی قانون کالعدم ہو جائے گا تو اس خلاء کی جگہ کونسا قانون آئے گا۔ دوسرے لفظوں میں یہ نہیں کہا گیا کہ ہائی کورٹ کسی قانون کو اسلام کے مطابق بنا سکے گا۔

اس خوفناک صورت حال پر قابو پانے کے لیے جس میں عدالتی کام رکنے کا احتمال تھا اور نئے قانون کی آمد سے پہلے پرانے قانون کو کالعدم قرار دینے کی فنی غلطی نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی، ایک قانون دان مسٹر رفیق احمد باجوہ نے سیشن کورٹ میں قتل کے ایک مقدمے کے سلسلے میں تعزیرات پاکستان، قانون شہادت اور ضابطہ فوجداری کو چیلنج کر دیا اور دعویٰ کیا کہ یہ تینوں غیر اسلامی ہیں، لہذا انہیں کالعدم قرار دیا جائے۔ سیشن جج نے کہا کہ یہ کام ہائی کورٹ کر سکتا ہے، آپ اس سے رجوع کریں۔ مسٹر باجوہ کے ہائی کورٹ سے رجوع کرنے پر انہیں بتایا گیا کہ جنرل ضیاءالحق کے اعلان کی قانونی شکل سامنے نہیں آئی، لہذا اسے محض اعلان سمجھنا چاہیے اس حکم کا نفاذ نہیں ہوا۔

اس نشاندہی نے متعلقہ حلقوں کو خبردار کر دیا، دگرنہ انہی دنوں یہ بات بھی سننے میں آئی تھی کہ ملک کی بے شمار عدالتوں میں متعدد زیر سماعت مقدمے اور ان کی کارروائی، جن میں مسٹر بھٹو کے خلاف مقدمۂ قتل بھی شامل تھا، اس اعلان کی روشنی میں چیلنج کئے جا رہے ہیں، چنانچہ یہ مقدمے اور یہ کارروائی اس بنا پر کالعدم قرار دی جا سکتی تھی کہ قتل کے ملزم کی گرفتاری سے لے کر عدالتی کارروائی تک طریق کار اور بنیادی اصول اسلام اور پاکستان کے رائج برطانوی قانون میں مختلف ہیں اور اگر ہائی کورٹ محض اس بنا پر کہ کوئی قانون اسلام کے منافی ہے، اس کو کالعدم قرار دے دے، لیکن اسے یہ اختیار نہ ہو کہ اسلام کے مطابق قانون وضع کرے تو عدالتی اور قانونی دنیا میں پیدا ہونے والا خلاء ملکی معاملات کو درہم برہم کر دیتا ہے اور لاقانونیت کی فضا پیدا ہو جانے کا خطرہ سامنے آ جاتا ہے۔

اسلامی مشاورتی کونسل کا کردار

معلوم یہ ہوا کہ جنرل ضیاء صاحب کے اعلان کے بعد متذکرہ صورت حال پر قابو پانے کے لیے یہ تمام امور اسلامی مشاورتی کونسل کے سپرد کر دیے گئے اور جب تک متبادل اسلامی قوانین تیار نہیں کر لئے جاتے اعلان پر عمل درآمد نہیں ہو سکتا، چنانچہ آج کل اسلامی مشاورتی کونسل جس کے چیئرمین سابق جسٹس مسٹر افضل چیمہ ہیں، یہ کام کر رہی ہے، وہ کب تک اس کام سے فارغ ہو گی اور کیا ماضی کی طرح ایسے کاموں کو اسلام دشمن طاقتیں اور عناصر پایۂ تکمیل تک پہنچنے دیں گے یا نہیں، اس بارے میں یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے، تاہم پاکستان کی سبھی سیاسی جماعتیں اور عوام کے تمام طبقات جس ایک مطالبے پر متفق ہیں، وہ ہے نظام مصطفےٰ کا قیام اور اسلامی قوانین اسی نظام کا ضروری حصہ ہیں۔

امید کی جانی چاہیے کہ اس سلسلے میں مثبت نتائج سامنے آئیں گے۔ آیئے یہ دیکھیں، اسلام قتل کے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے اور اسلامی تاریخ میں اس بھیانک انسانی جرم کو ختم کرنے کے لیے کیا اقدامات کئے گئے ہیں۔ نیز اگر ہمیں پاکستان میں اسلامی قوانین کو نافذ کرنا ہے تو ہمیں اس کی مثالیں کہاں سے ملیں گی۔

قرآن حکیم کا ارشاد

حسب ذیل آیات ملاحظہ کیجئے (ترجمہ)

(۱) "اسی بنا پر ہم نے بنی اسرائیل کو لکھ دیا تھا کہ تم میں سے جس شخص نے کسی ایک آدمی کا خون بہایا یا فساد کا ارتکاب کیا تو اس کا یہ عمل اللہ کے نزدیک ایسا ہے جیسے اس نے تمام انسانوں کو ہلاک کیا اور اگر کسی انسان نے دوسرے انسان کی جان بچائی تو اس کا یہ عمل ایسا ہے جیسے اس نے تمام انسانوں کو ہلاکت سے بچا لیا"

(سورۃ مائدہ، آیت ۳۲)

(۲) "اچھے لوگ بلاوجہ کسی کی جان نہیں لیتے اور نہ زنا کرتے ہیں۔ جو شخص ایسا کرے گا وہ اپنے کئے کی سزا پائے گا۔"

(سورۃ فرقان - آیت ۶۸)

(۳) "اے محمدؐ میں تجھے بتاؤں کہ تجھ پر کیا پابندیاں عائد کی گئی ہیں —— کسی ایسی جان کو جسے خدا نے محترم قرار دیا ہو، ہلاک نہ کرو سوائے اس کے کہ ایسا کرنا حق و انصاف کا تقاضا ہو۔"

(سورۃ الانعام - آیت ۱۵۱)

یہ آیات ظاہر کرتی ہیں کہ اسلامی معاشرے میں ایک انسان کا دوسرے کو بلاوجہ قتل کرنا کتنا خوفناک اور بھیانک جرم ہے۔

مفسرین اور فقہا کے نزدیک اسلام میں قتل عمد کے

نواب محمد احمد خاں قتل کیس میں وعدہ معاف گواہ مسعود محمود پر طویل جرح کیوں ہوئی ؟

ملزم کو مقتول کے وارث معاف نہ کریں تو وہ خوں بہا لے سکتے ہیں اور یہ رقم مقتول کے وارثوں کو مل سکتی ہے، لیکن قصاص میں جان لینے کا حق ریاست کو ہے اور یہ حق اس لئے مقتول کے عزیزوں کو نہیں دیا گیا کہ وہ غصے میں آ کر اپنے حق سے تجاوز نہ کریں۔

اسلام میں قتل کی وجوہات

قرآن و حدیث کی روشنی میں اور خلافتِ راشدہ کے دور سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ درجِ ذیل وجوہ ایسی ہیں کہ ان میں قتل کو جائز قرار دیا گیا:

(۱) کسی قاتل کو مقتول کے بدلے میں قتل کیا جائے۔ یہ کام ریاست کے ذمے ہے۔

(۲) اسلام قبول کر کے اسے ترک کرنے والے "مرتد" کو قتل کیا جائے۔ یہ بھی اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے۔

(۳) شادی شدہ زانی اور زانیہ کو سنگ زنی کے ذریعے قتل کیا جائے۔ یہ عمل ریاست کے حکم پہ عام لوگ کرتے ہیں۔

(۴) خدائی دعویٰ کرنے والے یا اس کے پیروکار مشرک کو قتل کیا جائے۔ یہ کام بھی ریاست کا ہے۔ کسی فرد کو حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے طور پہ یہ کام سرانجام دے۔

(۵) اسلامی ریاست پر فوجی حملہ کرنے والے جارحین کو قتل کیا جائے۔

اسی ذیل میں جہاد کے تحت میدانِ جنگ میں دشمن کا قتل بھی آ جاتا ہے، لیکن جہاد کے لیے ضروری ہے کہ مدِمقابل فریق غیر مسلم ہو اور اسلامی ریاست خود اس کا اعلان کرے، اگر چند مسلمانوں کے افراد یا گروہ کسی اسلامی ریاست کی طرف سے اعلانِ جہاد کے بغیر اپنے طور پر غیر مسلموں پر حملہ کر دیں تو یہ جہاد نہیں ہوگا۔

قتلِ عمد اور قرآن

قتلِ عمد یعنی جان بوجھ کر انسان کی بلا جواز جان لینے کے بارے میں قرآنِ کریم کے ارشادات حسب ذیل ہیں:

(۱) "اے اہلِ ایمان مقتولوں کے بارے میں تم پر قصاص کو ضروری قرار دیا ہے۔ آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت۔"

(البقرۃ - آیت ۲۱۷)

(۲) "اگر تم سمجھدار ہو تو تمہارے لئے قصاص ہی میں زندگی ہے۔" (البقرۃ - آیت ۲۱۸)

(۳) "ہم نے تو پہلے لوگوں کے لئے بھی کتاب ہدایت میں ان پر ضروری قرار دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور زخم کے بدلے زخم ہے۔ جو شخص معاف کرنا چاہے اس کے لئے کفارہ موجود ہے۔" (المائدہ - آیت ۸۲۹)

(۴) "اور اسی جان کو ہرگز قتل نہ کرو جس کی خدا نے مخالفت کر دی ہے، تاوقتیکہ اس کے انصاف کے تقاضے پورے نہ ہو جائیں۔ اگر کوئی شخص مظلومانہ موت مارا جائے تو ہم نے اس کے وارث کیلئے قصاص کا اختیار دیا ہے، مگر یہ رعایت اس صورت میں دی گئی ہے کہ وہ اپنے حق سے تجاوز نہ کرے۔" (بنی اسرائیل - آیت ۸۲۹)

واضح رہے کہ قصاص سے مراد بدلہ ہے یعنی قتل کے بدلے میں قتل ــــ اور اسلام کو اپنا دین ماننے والے تمام مکاتبِ فکر قاتل کو دی جانے والی اس سزا پر متفق ہیں اور اس بارے میں مسلمانوں کے سب سے بڑے دو فرقے یعنی شیعہ اور سُنّی اصحاب میں بھی کوئی اختلاف نہیں۔

رسولِ کریمؐ نے فرمایا

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہاں چند ایک اقوال رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کے حوالے سے پیش کئے جائیں:۔

(۱) حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ بڑے گناہوں میں سے سب سے بڑا گناہ شرک ہے اور اس کے بعد سب سے بڑا گناہ انسان کا قتلِ ناحق ہے۔

(۲) حضرت ابنِ عمرؓ سے روایت ہے کہ مومن اپنے دین کے دائرے میں اس وقت تک رہتا ہے جب تک کسی کا خون نہیں بہاتا۔

(۳) امام نسائیؒ کے حوالے سے ایک متواتر حدیث یہ ہے کہ رسولِ کریمؐ نے فرمایا: قیامت کے دن سب سے پہلے جس چیز کا حساب لیا جائے گا وہ نماز ہے اور لوگوں کے معاملات میں سب سے پہلے خون کے دعووں کے فیصلے ہوں گے۔

اسلامی ریاست میں قتل کے واقعات

حضورؐ نے اپنے دور میں اور ان کے وصال کے بعد خلفاءِ راشدین اور صحابہ کرام نے قتلِ انسانی کے فتنے کو ختم کرنے کے لیے قرآنی احکامات کی شدّت سے پابندی کی۔ مثال کے طور پر:۔

(۱) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک مسلمان نے ایک ذمی کو (یاد رہے کہ ذمی اس غیر مسلم کو کہتے ہیں جو اسلامی ریاست میں آزاد شہری کی حیثیت سے رہتا ہے اور ان سہولتوں کے عوض جو اسے حاصل ہیں، ریاست کو ایک مخصوص رقم بطور ٹیکس ادا کرتا ہے جسے "جزیہ" کہتے ہیں) قتل کر دیا تو آپؐ نے مسلمان کو ذمی کے بدلے میں قتل کرنے کا حکم جاری فرمایا اور صاف طور پہ یہ کہا کہ "اس غیر مسلم شہری کی جان کے تحفظ کا میں سب سے زیادہ ذمہ دار ہوں۔"

(۲) حضرت عمرؓ کے زمانے میں قبیلہ بکر بن وائل کے ایک شخص نے حیرہ کے ایک ذمی کو قتل کر دیا، اس پر انہوں نے قاتل کے قتل کا حکم جاری کر دیا۔

(۳) حضرت عثمانؓ کے زمانے میں عبید اللہ ابنِ عمر کے قتل کا فیصلہ دیا گیا، کیونکہ انہوں نے ہرمزان اور ابو لؤلؤ کی بیٹی کو اس شبہے میں قتل کر دیا کہ شاید وہ ان کے والد حضرت عمرؓ کے قتل کی سازش میں شریک ہیں۔

(۴) حضرت علیؓ کے زمانے میں ایک مسلمان پر ایک غیر مسلم ذمی کے قتل کا الزام لگایا گیا۔ حضرت علیؓ نے قصاص یعنی بدلے میں قتل کا حکم دیا۔ مقتول کے بھائی نے عرض کی کہ میں نے خون معاف کیا، لیکن حضرت علیؓ مطمئن نہ ہوئے اور فرمایا معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے تمہیں

ڈرایا دھمکایا ہے۔ اس نے کہا جی نہیں، میں نے خون بہا لینے پر آمادگی کا اظہار کیا ہے۔ حضرت علیؓ نے ملزم کی رہائی کا حکم دیا اور کہا "ہر شخص جو اسلامی ریاست کے دائرے میں رہتا ہے، اس کا قتل ریاست کی نظر میں یکساں جرم ہے۔"

(۵) خود حضرت علیؓ پر جب قاتلانہ حملہ ہوا تو آپ نے ہدایت کی "حسن یاد رکھو! مجھ پر حملہ کرنے والے کو فوراً قتل نہ کرنا۔ اگر میں زندہ رہا تو اسے صرف حملہ کرنے کے جرم میں سزا دوں گا۔ میں مر گیا تو اسے قتل کر دینا، لیکن اسے اذیت نہ دینا اور ایک ہی وار میں اس کا کام تمام کر دینا۔" چنانچہ اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

قاتل کے دیگر جرائم

اسلام کی نظر میں اگر ایک شخص قاتل ہے اور ساتھ ہی اس نے دیگر جرائم کا بھی ارتکاب کیا ہے تو اسے اسلامی قانون میں ہر جرم کی الگ سزا دی جائے گی۔ مثال کے طور پر ایک شخص نے چوری کی، زنا کیا اور قتل کا مرتکب ہوا تو چوری میں اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ اگر دوبارہ چوری کا ارتکاب کیا تو دوسرا ہاتھ بھی کاٹ دیا جائے گا۔ بعض فقہاء کے نزدیک قاضی چاہے تو اس کے پاؤں بھی کاٹ سکتا ہے، کیونکہ وہ بھی اس جرم میں معاون تھے۔

اس طرح ایک شخص شادی شدہ ہونے کے باوجود زنا کا مرتکب ہوتا ہے تو اسے سنگسار کیا جانا چاہیے اور شراب پیتا ہے تو اسے کوڑے لگانے ہوں گے۔ اور اگر بدقسمتی سے اس نے سارے جرائم کا ارتکاب کیا تو سبھی سزائیں اس کو ملیں گی اور اس کے بچنے کی کوئی صورت نہ ہوگی، بلکہ بعض فقہا نے تو یہاں تک کہا کہ اگر قاتل صاحبِ حیثیت اور صاحبِ اختیار ہو تو اسے قتل کی سزا دینا زیادہ بہتر ہے۔ خواہ مقتول کے وارث اسے معاف کرنے اور خون بہا لینے پر بھی رضامند کیوں نہ ہو جائیں۔ کیونکہ مجرم اپنی حیثیت اور اختیار کے بل پر آئندہ بھی قتل کا مرتکب ہو سکتا ہے۔

منحرف گواہوں کی سزا

اسلامی قانون کی نظر میں گواہوں کا انحراف ناقابلِ معافی جرم ہے، کیونکہ اسلام بنیادی طور پر جھوٹ کے خلاف ہے اور جو کوئی شخص ایک بات سے انکار کرتا ہے تو دونوں باتیں ناقابلِ اعتبار ہو جاتی ہیں۔ امام شافعی کہتے ہیں کہ اگر ایسے شواہد موجود ہوں کہ قتل کا ثبوت ملتا ہو، لیکن گواہ منحرف ہو جائیں تو ایسے گواہ کا قتل بھی واجب ہے۔ یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ اسلام میں جھوٹی گواہی دینا یا سچی بات چھپانا کتنا بڑا جرم ہے۔

اگر عدلیہ انصاف نہ کرے تو

اسلامی قانون کی نظر میں اگر کسی قاضی کے متعلق یہ بات ثابت ہو جائے کہ وہ مجرم کو بچانا چاہتا ہے تو قاضی کو نہ صرف معزول کرنے کا حکم ہے، بلکہ واضح کر دیا گیا کہ اعانتِ جرم میں وہ قاضی بھی واجب القتل ہے۔ کیونکہ قتل میں معاونت کرنے والا اسلامی قانون کے مطابق خود قاتل ہے۔ یہی وجہ ہے فوج کو لڑانے والا دشمن خود واجب القتل ہے۔ خواہ اس نے لڑائی میں براہ راست حصّہ نہ لیا ہو۔ چنانچہ سورۃ توبہ کی یہ آیت اس کا واضح ثبوت ہے کہ "لڑنے والوں کے سرداروں اور لیڈروں کو قتل کر دو۔"

سفارش کی گنجائش نہیں

کہتے ہیں کہ فاطمہ نامی ایک عورت نے چوری جو بااثر قبیلہ سے تعلق رکھتی تھی، کچھ لوگوں نے حضورؐ کی خدمت میں پیش ہو کر سفارش کی۔ آپؐ نے کہا اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں محمدؐ کی جان ہے اگر میری بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔

اس قسم کی متعدد مثالیں موجود ہیں کہ بعض اسیروں کے بارے میں یہود و نصاریٰ اور بعض دیگر طاقتوں نے اسلامی ریاست کے سربراہ سے درخواست کی کہ فلاں فلاں مجرم کو چھوڑ دیا جائے، لیکن ایک مثال بھی ایسی موجود نہیں کہ جرم ثابت ہونے کے بعد مجرم کو چھوڑ دیا گیا ہو۔ خاص طور پر قتل کا جرم ایسا ہے جس میں اسلامی ریاست اور اس کی عدلیہ یہ اختیار ہی نہیں رکھتی کہ قاتل کو معاف کر دیا جائے، کیونکہ اسلام نے یہ اختیار مقتول کے وارثوں کو دیا ہے۔

سفارش کے ضمن میں یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ اگر مجرم چالاک ہو اور مختلف ذرائع سے عام لوگوں کو ریاست کے خلاف مشتعل کرتا ہو اور اسلامی قانون کی بے حرمتی کرنے پر تل گیا ہو تو نہ صرف وہ بلکہ جو لوگ اس کے ساتھ تعاون کریں انہیں بھی کوڑوں کی سزا دی جاتی ہے۔

خلیفہ چہارم حضرت علیؓ کے زمانے میں حسن بن صباح نے لوگوں کو اسلامی ریاست کے خلاف اکسایا اور مشتعل کیا اور پھر اگرچہ خود فرار ہو گیا، لیکن خلیفہ رسول نے اس کے ساتھیوں کو کوڑے لگوائے۔

اپیل کا حق

اسلامی قانون میں بھی قاضی کے فیصلے کے بارے میں ملزم کے پاس اس سے بڑی عدالت یعنی قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کے پاس جانے کا حق ہے جو اس کے کیس پر نظرِ ثانی کر سکتا ہے اور مزید توثیق کے لئے اسے آخری مرحلے میں ریاست کے سربراہ کے سامنے بھی پیش کیا جا سکتا ہے، تاہم ان میں سے کسی کو اس امر کا اختیار نہیں کہ اسلامی قانون میں کسی قسم کی تبدیلی کر سکیں۔ مثلاً قتل کے ملزم کا معاملہ درپیش ہو تو قاضی سے قاضی القضاۃ اور سربراہ مملکت تک کسی کو یہ اختیار نہیں کہ وہ جرم ہونے کے باوجود ملزم کو رہا کر دے یا مقتول کے وارثوں پہ دباؤ ڈالے یا انہیں ترغیب دے کہ وہ ملزم کو معاف کریں یا اس سے خون بہا لینے پر رضامند ہو جائیں۔

ریاست کو معاف کرنے کا اختیار نہیں

اسی طرح اسلامی قانون کی نظر میں قاتل اسلامی ریاست کے سربراہ سے رحم کی اپیل نہیں کر سکتا اور نہ سربراہ ایسی اپیل سننے کا مجاز ہے۔ کیونکہ وہ سرے سے قتل کے ملزم کو معاف کرنے کا اختیار ہی نہیں رکھتا۔ یہاں ایک بار پھر اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ پاکستان میں رائج برطانوی طرز کے قانون میں قتل کا مقدمہ چلانا ریاست کی ذمہ داری ہے اور ریاست ہی کسی قاتل کو معاف کر سکتی ہے، جبکہ اسلامی قانون کے مطابق مقدمہ چلانا اور سزا دینا ریاست کا کام ہے، لیکن قتل کی سزا صرف اور صرف موت ہے سوائے اس کے کہ اسلامی احکام کے مطابق مقتول کے وارث چاہیں تو اسے معاف کر سکتے ہیں یا خون بہا لے سکتے ہیں۔

تیسری صدی ہجری کے

قاتل حکمران کا عبرتناک انجام

یہ عباسی خلیفہ راضی باللہ کا دورِ حکومت ہے جو فوج کی مدد سے برسرِ اقتدار آئے ہیں۔ جامع مسجد منصور نمازیوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی ہے۔ امام نماز سے فارغ ہوکر دعا کے لیے ہاتھ اٹھانے ہی والا تھا کہ مسجد کی آخری صف سے ایک آواز آئی؛

"لوگو مجھے دیکھو! میں نابینا اور محتاج ہوں، قدرت نے مجھ سے انتقام لے لیا ہے —— لوگو میرے اعمال کو بھول جاؤ، میرے حال پر رحم کرو، مجھے تم جانتے ہو، میں کوئی غیر نہیں، تمہارا خلیفہ ہوں، لیکن گردشِ آسماں نے مجھے بھیک مانگنے پر مجبور کردیا ہے۔"

نئے لوگوں نے آواز سن کر اندھے بھکاری پر نظر ڈالی اور خوف کے مارے ان کی چیخ نکل گئی۔

یہ سابق حکمران خلیفہ قاہر باللہ جس کا یہ نام لقب کے طور پر ہر کوئی جانتا تھا واضح رہے کہ قاہر قہر کرنے والے کو کہتے ہیں، اس کا اصل نام محمد بن مقتدر بن طلحہ بن متوکل تھا۔

قاہر باللہ، مقتدر باللہ کے بعد برسرِ اقتدار آیا تھا۔ اس نے خلیفہ بنتے ہی لوگوں پر ناجائز ٹیکس عائد کردیے، انہیں اذیت دینے لگا۔ مقتول خلیفہ مقتدر کی سوتیلی ماں کو اتنا مارا کہ وہ جاں بحق ہوگئی۔

۳۲۱ھ میں فوج کے چند افسروں نے اس کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا مگر اس نے حیلہ بازی سے سب کو گرفتار کروایا اور قتل کرادیا۔ پھر متبادل حکمران ابن مکتفی کو قتل کرادیا۔ اگرچہ اسے فوج کی پشت پناہی حاصل تھی، کئی مخالفین زندہ دیوار میں چنوا کر مار ڈالے۔

خلیفہ قاہر باللہ تاریخ کا بڑا چرب زبان حکمران تھا۔ ہر مجلس میں نئی اور ڈرامائی باتیں کرنے کا عادی تھا۔ اس کے فیصلوں کے بارے میں لوگ کچھ سوچ نہیں پاتے تھے۔ وہ کہتا کچھ تھا اور کرتا کچھ۔ اقتدار کی خاطر اس نے ملک کی ہر اہم شخصیت کو قتل کرادیا۔ کئی بار اس کے خلاف فوج نے علمِ بغاوت بلند کیا مگر ناکام رہی۔

آخرکار لوگوں نے اسے خدا کے عذاب کے طور پر قبول کرلیا اور ہر شخص پر اس کی ہیبت چھا گئی۔ ابنِ مقلہ اس زمانے کا مشہور لیڈر تھا۔ اپنی گرفتاری سے ڈر کر روپوش ہوگیا۔ خلیفہ نے اس کی عدم موجودگی میں اس کے گھر کو آگ لگوادی اور اس کے اہلِ خانہ اس میں جل مرے۔

اس کے ساتھ ہی دوسرے مخالفین کے گھر بھی تباہ و برباد کروادیے، فوج کو ظلم و تشدد سے رام کرلیا۔ مقتدر کی بیوہ اس کی سوتیلی ماں تھی، لیکن اس نے حقیقی ماں کی طرح اس کی پرورش کی تھی، اس خاتون کے قتل کے بعد اس کی لاش کی بے حرمتی کروائی۔ اس واقعے نے لوگوں کو دہشت زدہ کردیا کہ جو شخص اپنی ماں کے ساتھ یہ سلوک کرسکتا ہے اس سے کسی بھی بڑے اقدام کی توقع کی جاسکتی ہے۔ چند دنوں کے بعد اس نے بعض مشاہیر کی موجودگی میں اپنے لیے "منتقم من اعداء دین اللہ" کا لقب تجویز کیا جس کا مطلب تھا اللہ کے دشمنوں سے انتقام لینے والا۔ حالانکہ وہ اللہ کے دشمنوں سے نہیں اپنے ذاتی دشمنوں سے اللہ کے نام پر انتقام لیتا تھا۔

ایک بار لوگوں کو خوش کرنے کے لئے اس نے ناچ گانے اور شراب پر پابندی عائد کی، لیکن خود باقاعدگی سے شراب پیتا اور پیشہ ور عورتوں سے گانے سنتا اور انحطاط کرتا رہا۔

۳۲۲ھ میں قاہر نے اس دور کی مشہور شخصیت اسحاق بن اسماعیل نوبختی کو کنوئیں میں الٹا لٹکا کر کنواں بند کرادیا۔ اس سال فوج کے ایک بااثر آدمی کے ذریعے ابنِ مقلہ نے اس کے مظالم سے تنگ آکر فوج کو دوبارہ راست اقدام کے لئے تیار کیا۔ یہ فوجی حملہ اچانک بھی تھا اور سخت بھی۔ قاہر باللہ اور اس کے ساتھی بھاگ نکلے لیکن فوج نے قابو کرلیا۔ راضی باللہ انقلابی حکومت کے سربراہ کی حیثیت سے خلیفہ بنا دیا گیا۔

قاہر باللہ نے اپنے دورِ حکومت میں لوگوں کو لوٹ کر بے بہا دولت اکٹھی کرلی تھی، چنانچہ راضی نے اس سے دولت واپس کرنے کو کہا لیکن اس نے انکار کردیا، تاہم بہت سختی کی گئی تو اس نے کہا تم مجھ پر سختی نہیں کرسکتے، میں قانونی طور پر خلیفۂ اسلام ہوں، تم نے میرے ہاتھ پر بیعت کی ہے اور میری اطاعت کے پابند ہو۔

عام لوگوں کا خیال تھا خلیفہ قاہر پر سختی درست نہیں کیونکہ یہ زیرک خلیفہ ہے اور دوبارہ اپنے عہدے پر بحال ہوجائے گا۔ اس کے مظالم سے عاجز لوگوں میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں تھی جو سرے سے اس کی معذولی کو بھی غلط تصور کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ خلیفہ کی معذولی محض افواہ ہے کیونکہ اس سے پہلے اس کو معذول کرنے کی ہر کوشش ناکام ہوچکی تھی۔ اس کے حواریوں کا کہنا تھا کہ خلیفہ قاہر باللہ کی حکومت خدا کی مرضی سے چل رہی ہے، یہ اللہ کا فرستادہ ہے۔ اسے کوئی طاقت معذول نہیں کرسکتی۔ جب لوگوں کو کسی طرح اس کی معذولی کا یقین نہیں آیا تو راضی نے اس کی آنکھوں میں گرم سلائیں پھیر کے اسے اندھا کردیا۔ اس کی آنکھوں کے ڈھیلے لٹک کر رخساروں پر آگئے، جو دیکھتا، عبرت پکڑتا۔ اندھا ہونے کے بعد چھپائی ہوئی دولت کے بارے میں اس سے دوبارہ بازپرس کی گئی تو اس نے یہ کہہ کر ایک جگہ کی نشاندہی کی کہ میں نے وہاں خزانہ دفن کرادیا ہے، وہاں سے نکال لو۔ کہا نشاندہی کرو، بولا وہ بہت بڑا باغ ہے، میں اندھا آدمی کیسے نشاندہی کرسکتا ہوں۔ آپ باغ کھود کر مال نکال سکتے ہیں۔ جب باغ کھودا گیا تو وہاں کچھ نہ تھا۔ اس سے پھر سوال کیا تو اس نے کہا تم میرے باغ پر عیش کرتے تھے، میں کیسے گوارا کرلیتا کہ تم یوں ہی عیش کرتے رہو۔ میں نے حیلہ کرکے تم سے باغ ضائع کروایا ہے، خزانہ وزانہ بھول جاؤ۔

نئی حکومت نے ملک کے حالات پر توجہ دی اور مصنوعی قحط کو ختم کیا۔ خلیفہ قاہر باللہ خود اپنی جمع کی ہوئی دولت سے اندھا ہونے کی وجہ سے محروم ہوگیا، وہ نہ تو اسے نکال سکتا تھا اور نہ نکلوا سکتا تھا، کیونکہ فوج اس کی نقل و حرکت کا جائزہ لیتی تھی۔ آخری عمر میں وہ اپنا پیٹ پالنے کے لئے جامع مسجد منصور کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر بھیک مانگا کرتا تھا اور لوگوں کو اس فقیر کی حالت دیکھ کر یقین نہیں آتا تھا کہ یہ شخص ملک کا سربراہ بھی رہ چکا ہوگا۔ تاہم وہ چیخ چیخ کر اپنا تعارف کرواتا تھا اور لوگ اسے بھیک دیکر مسجد سے باہر نکلتے تھے۔

یہ تاریخی کردار ۵۳ سال کی عمر میں ۳۳۹ھ میں انتہائی کسمپرسی کی حالت میں مرا، لوگ اس کا جنازہ دفنانے کے لئے تیار نہ تھے، لیکن حکومت نے ایک غریب شہری کی حیثیت سے اسے کفن پہنا کر دفن کردیا۔ خلافتِ عباسیہ کے لئے یہ شخص عبرت کا نشان بن گیا۔ جب کبھی تاریخ میں کوئی ایسا سربراہ پیدا ہوتا ہے لوگوں کو قاہر باللہ کی بادشاہی اور پھر گدائی یاد آجاتی ہے۔

فیصلے کے منتظر

- گرفتاری ضمانت پر رہائی اور دوبارہ گرفتاری
- سے فیصلہ محفوظ ہونے تک
- تاریخ وار مکمل رُوداد

مسٹر بھٹو کے خلاف قتل کا مقدمہ

۳ ستمبر ۷۷ء کو پولیس نے سابق وزیر اعظم مسٹر بھٹو کو ان کی اقامت گاہ واقع ۷۰ کلفٹن کراچی سے گرفتار کیا۔ ریڈیو پاکستان نے ایک بجے کی خبروں میں اعلان کیا کہ مسٹر بھٹو کی گرفتاری نواب محمد احمد خان مرحوم کے قتل کے سلسلے میں عمل میں لائی گئی ہے جنہیں نومبر ۷۴ء میں ہلاک کر دیا گیا تھا۔

نواب محمد احمد خان قومی اسمبلی کے سابق ممبر مسٹر احمد رضا خاں قصوری کے والد تھے ـــــ مسٹر احمد رضا قصوری نے ۱۱ نومبر ۷۴ء کو اچھرہ پولیس سٹیشن میں ایف۔ آئی۔ آر نمبر ۴۰۲ کے تحت مقدمہ درج کرایا تھا۔ اور کم و بیش تین برس بعد ۳ ستمبر ۷۷ء کو مسٹر بھٹو کی گرفتاری اس قتل کے سلسلے میں عمل میں آئی۔

مسٹر احمد رضا خاں نے پولیس اسٹیشن میں جو ایف آئی آر یعنی ابتدائی رپورٹ درج کرائی تھی اس کا مضمون یہ تھا:

ایف آئی آر

"۷ ارجنوری ۷۲ء کو آج سے قبل قصور میں مجھ پر بذریعہ فائرنگ قاتلانہ حملہ ہوا۔ اور مجھے بھی گولیاں لگیں۔ جس کا مقدمہ تھانہ شہر قصور میں درج ہوا۔ اُس کے بعد مورخہ ۲۴ اگست ۷۴ء کو اسلام آباد میں مجھ پر خودکار آلہ سے حملہ ہوا۔ اس کا مقدمہ بھی تھانہ اسلام آباد میں درج ہے۔ جس میں مفصل حالات ہیں۔

پرسوں ۹ نومبر ۷۴ء کو مجھے محمد حنیف الیکٹریشن ٹیوب ماڈل ٹاؤن سوسائٹی نے بتایا کہ ایک یوم قبل چار پانچ آدمی میرے گھر کا پتہ دریافت کر رہے تھے اور میری تلاش کر رہے تھے

آج قریب ساڑھے بارہ بجے رات میں مع اپنے والد نوابزادہ ایم اے خان، اپنی والدہ اور اپنی خالہ مسز محمد مہدی خان اپنی کار نمبر LEJ 9495 پر سید بشیر حسین شاہ کی کوٹھی سے شاہ جمال کی طرف جا رہے تھے۔ میری کار دائیں ہاتھ ڈرائیو ہے، جس کو میں خود چلا رہا تھا۔ میرے بائیں ہاتھ میرے والد نوابزادہ ایم اے خان، میرے عقب میں پچھلی سیٹ پر میری والدہ اور ان کے بائیں جانب میری خالہ بیٹھی تھی۔

مقتول کے بیٹے

جب گول چکر کے قریب کار آئی تو اچانک دائیں طرف سے میری گاڑی پر فائرنگ شروع ہو گئی جو تقریباً ایک سو پچاس گز تک پر سے گاڑی پر فائرنگ ہوئی۔ چند ایک گولیاں میرے والد کے سر پر لگیں کافی خون بہنے لگا اور کار دائیں طرف سے چھلنی ہو گئی جس کے شیشے ٹوٹ گئے۔ میں اپنے والد کو کار میں سیدھا امریکن ہسپتال گلبرگ لے آیا۔ جہاں پر میرے والد زخموں کی تاب نہ لا کر جاں بحق ہو گئے۔

یہ فائرنگ خودکار آلہ سے کی گئی ہے جس میں میرے والد نوابزادہ ایم اے خان قتل ہو گئے ہیں۔

یہ فائرنگ مجھ پر سیاسی وجوہات کی بنا پر ہوئی ہے، چونکہ میں قومی اسمبلی میں حزب اختلاف کا ممبر ہوں اور تحریک استقلال کا جو کہ ملک کی سیاست میں حکومتی پارٹی کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہی ہے، کارکردگی کی بنا پر سیکرٹری ہوں اور گورنمنٹ پر کڑی تنقید کرتا ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ بیس جون ۷۴ء کو قومی اسمبلی میں مسٹر بھٹو نے مجھے مخاطب کر کے کہا تھا کہ میں اس شخص سے تنگ ہوں اور یہ شخص میری برداشت سے باہر ہے۔ یہ الفاظ قومی اسمبلی کے ریکارڈ اور اخبارات میں موجود ہیں۔

دستخط انگریزی   احمد رضا قصوری ایم این اے
۱۳۰۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاہور
۱۱ نومبر ۷۴ء"

گرفتاری اور ریمانڈ

مسٹر بھٹو کو تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۳۰۲/ ۱۰۹ اور ۱۲۰ بی کے تحت گرفتار کیا گیا۔

۳۰۲ کی دفعہ قتل اور اقدام قتل، ۱۰۹ کی دفعہ قتل پر اکسانے اور ۱۲۰ بی کی دفعہ قتل کی سازش کرنے کے الزامات پر مبنی ہوتی ہے۔

مسٹر بھٹو کی گرفتاری ۳ ستمبر ۷۷ء کی صبح ساڑھے چار بجے کراچی میں ان کے مکان واقع ۷۰ کلفٹن سے عمل میں آئی۔

مسٹر بھٹو کو ایک خصوصی طیارے میں لاہور لایا گیا۔ اس موقع پر ان کی بیگم اور صاحبزادی نے پولیس

کی بدسلوکی کی شکایت کی، مگر متعلقہ حکام نے اس کی سختی سے تردید کی۔ اخباری اطلاعات کے مطابق وہ طیارہ جس کے ذریعے مسٹر بھٹو لاہور لائے گئے، رن وے سے دُور رکھا گیا اور طیارے سے اتار کر انہیں ایک جیپ کے ذریعے چھاؤنی کی ایک کوٹھی میں لے جاکر بند کر دیا گیا۔

اسسٹنٹ کمشنر مسٹر اسماعیل قریشی نے سات روز کے لیے ان کا ریمانڈ دیا اور قواعد کے مطابق لاہور چھاؤنی کی اس کوٹھی کو جیل کا حصہ قرار دیا گیا۔ بعض اطلاعات کے مطابق کوٹھی میں ایئرکنڈیشنر موجود نہ تھا جسے فوری طور پر نصب کیا گیا۔

درخواست برائے ضمانت

۴ستمبر ۷۷ء کو لاہور ہائی کورٹ کے مسٹر جسٹس کے۔ ایم صمدانی کی عدالت میں مسٹر بھٹو کی درخواست ضمانت پیش کی گئی۔ ان کی طرف سے مسٹر ایم۔ بی زمان بطور وکیل پیش ہوئے۔ جن کی معاونت مسٹر کمال اظفر، انور بھٹی، راجہ محمد انور، مسٹر عبدالستار نجم اور بیگم ریحانہ سرور نے کی۔

فاضل جج نے مسٹر بھٹو کے وکیل کے دلائل سننے کے بعد سماعت اگلے روز پر ملتوی کر دی۔

۵ستمبر کو ہائی کورٹ نے درخواستِ ضمانت پر براہِ راست غور کرنا منظور کیا اور مسٹر جسٹس صمدانی نے حکومت کے نام نوٹس جاری کر دیا۔ اس دوران ایف۔ آئی۔ اے کے افسر مسٹر بھٹو سے پوچھ گچھ کرتے رہے۔ درخواست دہندہ مسٹر بھٹو نے شکایت کی کہ پولیس زبردستی ان کی اقامت گاہ میں گھس آئی اور چوکیداروں کو زدوکوب کیا۔ مسٹر بھٹو نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ انہیں انتخابی مہم میں حصہ لینے سے روکنے کے لیے گرفتار کیا گیا ہے۔

۷ستمبر ۷۷ء کو اسسٹنٹ کمشنر چھاؤنی مسٹر اسماعیل قریشی نے مسٹر بھٹو کو کوٹ لکھپت جیل میں بھیجنے کا حکم دیا اور اس امر کے پیشِ نظر کہ حکومت کے اعلیٰ اور ممتاز عہدوں پر منصب رہے ہیں، ملزم کو جیل میں ان کے معیارِ زندگی کے مطابق بہتر کلاس دی جائے اور اہلِ خانہ کو ان سے ملنے دیا جائے۔ مسٹر بھٹو کے لیے جوڈیشل ریمانڈ ۱۳ ستمبر تک بڑھا دیا گیا۔ اس روز [illegible] بیگم [illegible] نے اپنے شوہر سے جیل میں ملاقات کی۔ کوٹ لکھپت میں مسٹر بھٹو کو گھر سے کھانا منگوانے کی اجازت بھی دی گئی اور ان کے وکلاء نے بھی ان سے ملاقاتیں کیں۔ [illegible]

۱۳ستمبر کو مسٹر جسٹس صمدانی کی عدالت میں مسٹر [illegible]

بار ایٹ لا، بطور پبلک پراسیکیوٹر پیش ہوئے اور انہوں نے دلائل دیتے ہوئے کہا کہ مسٹر احمد رضا قصوری کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا اور ایف ایس ایف نے اس پر عمل درآمد کیا، جس کے نتیجے میں ان کے والد نواب محمد احمد خان قتل ہو گئے۔

مسٹر ایم انور نے فاضل عدالت کو بتایا ایف ایس ایف کے سربراہ مسعود محمود، ڈائریکٹر آپریشنز میاں محمد عباس، انسپکٹر غلام حسین اور دو سب انسپکٹروں ارشد اقبال اور رانا افتخار نے تسلیم کیا ہے کہ مسٹر احمد رضا قصوری کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔

ضمانت پر رہائی

۱۳ستمبر کو لاہور ہائی کورٹ کے مسٹر جسٹس صمدانی نے مسٹر بھٹو کی درخواست ضمانت منظور کر لی اور مسٹر بھٹو کے وکیل مسٹر یحییٰ بختیار کو ہزار روپے نقد اور پچاس ہزار روپے کے دو مچلکے داخل کرنے کا حکم دیا۔

جس دفعہ کے تحت ضمانت منظور کی گئی، وہ ۴۹۷ ہے۔ اس کے الفاظ حسب ذیل ہیں۔

"ناقابلِ ضمانت جرائم میں ضمانت کی منظوری ان صورتوں میں ہو سکتی ہے۔

۱۔ جب ناقابلِ ضمانت جرم کا ملزم گرفتار کیا جاتا ہے، یا کسی تھانہ پولیس کا افسر انچارج اسے بغیر وارنٹ حراست میں لیتا ہے، یا وہ شخص عدالت میں پیش ہوتا ہے یا اسے پیش کیا جاتا ہے تو اسے ضمانت پر رہا کیا جا سکتا ہے، مگر ملزم کو اس صورت میں ضمانت پر رہا نہیں کیا جائے گا جب باور کرنے کے لیے کہ اس نے کوئی ایسا جرم کیا ہے جس کی سزا موت، عمر قید یا قید دس سال ہو، معقول شواہد موجود ہوں۔

جسٹس صمدانی کے فیصلے کا متن

جسٹس صمدانی نے ضمانت پر رہا کرتے وقت جو فیصلہ دیا اس کا متن یہ ہے:

"درخواست گزار کو اس مقدمے کے سلسلے میں گرفتار کیا گیا ہے جو شکایت کنندہ احمد رضا قصوری کی پولیس کو ۱۱ نومبر ۷۴ء کی رپورٹ پر درج ہوا تھا۔"

استغاثہ کے مطابق ۱۰ اور ۱۱ نومبر ۷۴ء کی درمیانی شب کو شکایت کنندہ پر اس وقت حملہ کیا گیا جب وہ اپنے والد اور دیگر رشتہ داروں کی معیت میں کار میں اپنے گھر لوٹ رہا تھا۔ اسے قتل کرنے کی کوشش کی گئی مگر وہ بچ نکلا تاہم اس کے والد زخمی ہو کر فوت ہو گئے۔ [illegible]

درخواست گزار پر ارتکابِ جرم میں اعانت کا الزام ہے، تفتیشی ادارے نے اس ضمن میں شہادتیں اکٹھی کی ہیں، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تفتیش ابھی مکمل نہیں ہوئی اور عدالت میں نامکمل چالان پیش ہوا ہے۔

جو مواد میرے روبرو پیش کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقے میں درخواست گزار کے ممکن حد تک ملوث ہونے کے متعلق خاصی واقعاتی شہادتیں موجود ہیں، مگر یہ مدِنظر رہے کہ اب تک جو شہادتیں جمع کی گئی ہیں، وہ زیادہ تر فقط واقعاتی ہیں۔

اعانتِ جرم میں براہِ راست ملوث ہونے کی شہادتوں کا جہاں تک تعلق ہے، انہیں مسعود محمود (ساتھی ملزم) کے بیانات سے تقویت ملتی ہے۔

مسٹر ایم انور فاضل سپیشل پبلک پراسیکیوٹر نے آج بیان کیا کہ مسعود محمود (ساتھی ملزم) کو اس مقدمے میں سلطانی گواہ بنایا گیا ہے اور وہ درخواست گزار اور دوسرے ملزم کے خلاف بطور گواہ پیش ہوگا، لیکن یہ امر دوبارہ مدِنظر رہے کہ اپنے ساتھی ملزم کی شہادت کی حیثیت قانونی اعتبار سے حتمی نہیں ہوتی، تاہم اس نوعیت کی شہادت کی بناء پر کسی کو مجرم قرار دینا بھی غیر قانونی فعل نہیں۔ عدالت کو یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مزید شہادتیں جو غالباً دستاویزی نوعیت کی ہیں، اکٹھی کی جا رہی ہیں۔

ان حالات میں میرا خیال ہے کہ کم از کم وقتی طور پر درخواست گزار ضمانت کا حقدار ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اگر ایسی شہادت دستیاب ہو جائے جس کی بناء پر ضمانت کی تنسیخ لازم آئے تو استغاثے کو اجازت ہوگی کہ اس سلسلے میں اس عدالت میں درخواست گزاری جائے۔

چنانچہ ہدایت کی جاتی ہے کہ اس عدالت کے رجسٹرار کی تسلی کے مطابق پچاس ہزار روپے کے ضمانت نامے اور اتنی ہی رقم کے دو مچلکے پیش کرنے پر درخواست دہندہ کو رہا کیا جائے۔

۱۳ستمبر ۱۹۷۷ء خواجہ محمد احمد صمدانی۔ جج

مسٹر بھٹو کی رہائی

۱۳ستمبر کو مسٹر بھٹو ضمانت پر رہا ہوئے اور انہوں نے اخبار نویسوں کے سامنے اپنی گرفتاری کی تفصیلات پیش کرتے ہوئے شکایت کی کہ ان سے بدسلوکی کی گئی، تاہم انہوں نے کہا کہ اگر وہ دوبارہ وزیر اعظم بنے تو یہ سب کچھ بُرے خواب کی طرح بھول جائیں گے۔

منسوخیٔ ضمانت کی درخواست

حکومت کی طرف سے مسٹر بھٹو کی ضمانت کی منسوخی

کے لیے لاہور ہائی کورٹ کے فل بنچ نے ۱۱ر ستمبر کو درخواست سماعت کے لئے منظور کر لی اور مسٹر بھٹو کے نام نوٹس جاری کر دیا۔

یاد رہے کہ نواب محمد احمد خاں کے قتل کے جرم میں مسٹر بھٹو کو گرفتار کیا گیا تھا مگر ہائی کورٹ کے مسٹر جسٹس صمدانی نے انہیں ضمانت پر رہا کر دیا تھا۔ سپیشل پبلک پراسیکیوٹر مسٹر ایم انور بار ایٹ لاء نے فل بنچ کے سامنے یہ دلائل دیے کہ قتل میں ملوث ایف ایس ایف کے سابق ڈائریکٹر جنرل مسٹر مسعود محمود نے وعدہ معاف گواہ کی حیثیت سے جو بیان دیا ہے اس میں یہ تسلیم کیا گیا کہ مسٹر بھٹو براہِ راست نواب محمد احمد خاں کے قتل میں ملوث ہیں۔ علاوہ ازیں مسٹر بھٹو کے سابق سیکورٹی افسر مسٹر سعید احمد خان نے غیر جانبدارانہ حیثیت میں جو بیان دیا اس سے بھی مسٹر بھٹو کے قتل میں ملوث ہونے کی تائید ملتی ہے۔

۲۴ر ستمبر کو فل بنچ نے اس درخواست کی سماعت کی، لیکن مسٹر بھٹو نے جو کمرۂ عدالت میں موجود تھے، فل بنچ کو بتایا کہ انہیں اپنے وکلاء سے مشورہ کا وقت نہیں ملا، چنانچہ فل بنچ نے ضمانت کی منسوخی کے سلسلے میں درخواست کی سماعت ۲۷ر ستمبر تک ملتوی کر دی۔

مسٹر بھٹو سپریم کورٹ میں

اسی روز راولپنڈی میں سپریم کورٹ میں مسٹر بھٹو کے وکیل مسٹر یحییٰ بختیار کی درخواست کی سماعت ہوئی۔ اس درخواست میں مسٹر بھٹو کی ضمانت کی درخواست منظور کرنے کے خلاف مقدمہ لاہور ہائی کورٹ کے فل بنچ میں منتقل کرنے کو غلط قرار دیا تھا اور لاہور ہائی کورٹ کے فل بنچ کی تشکیل کو چیلنج کیا گیا تھا۔ مسٹر یحییٰ بختیار کے مطابق لاہور ہائی کورٹ کے قائمقام چیف جسٹس جناب مولوی مشتاق حسین کی تقرری کو بھی چیلنج کیا گیا۔ سپریم کورٹ نے اپنے فیصلے میں کہا کہ مسٹر یحییٰ بختیار کو اس سلسلے میں لاہور ہائی کورٹ ہی سے رجوع کرنا چاہیے، کیونکہ کسی بنچ کی تشکیل دینا اسی کا کام ہے۔

دوبارہ ہائیکورٹ میں

۲۷ر ستمبر کو لاہور ہائی کورٹ کے فل بنچ نے جو پانچ ججوں پر مشتمل تھا مسٹر یحییٰ بختیار کے دلائل سنے جو مسٹر بھٹو کے وکیل تھے۔ مسٹر یحییٰ بختیار نے خود مقدمے کو ملتوی کرنے کی درخواست کی اور کہا کہ وہ سپریم کورٹ میں مصروف رہے ہیں، چنانچہ مقدمے کی سماعت ۳ر اکتوبر تک ملتوی کر دی گئی۔

۳ر اکتوبر کو مسٹر بھٹو کے خلاف مقدمۂ قتل کی پھر سماعت شروع ہوئی۔ مسٹر ایم انور نے اپنے دلائل پیش کیے اور انٹیلی جنس کی رپورٹوں کے بعض خفیہ حصے پڑھ کر سنائے۔

اگلے روز یعنی ۴ر اکتوبر کو بھی ایم انور کا بیان جاری رہا اور انہوں نے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مسٹر بھٹو نے محمد احمد خان کے قتل میں مرکزی کردار ادا کیا۔ اسی روز مسٹر بھٹو نے عدالت میں احتجاج کیا کہ وہ سزا یافتہ نہیں ہیں، لہٰذا انہیں ملزموں کے لیے بنائے گئے کٹہرے میں نہیں بٹھایا جا سکتا۔

ارشد اقبال کی درخواست

۴ر اکتوبر ہی کو مقدمۂ قتل میں ملوث ایف ایس ایف کے انسپکٹر ارشد اقبال کی طرف سے اس کے وکیل مسٹر ارشاد احمد قریشی نے ایک درخواست دائر کی جس کے مطابق مسٹر بھٹو کے مامور کردہ افراد مسٹر ارشد اقبال پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ وہ اپنے تحریری بیان سے منحرف ہو جائے اور یہ کہ ارشد اقبال کے انکار سے اس کی جان کو خطرہ ہے۔

واضح رہے کہ مسٹر ارشد اقبال نے دفعہ ۱۶۴ کے تحت مقامی مجسٹریٹ مسٹر ذوالفقار علی طور کی عدالت میں اقبالی بیان دیا تھا، جس میں کہا گیا تھا کہ ہمیں ایف ایس ایف کے افسروں کی طرف سے مسٹر احمد رضا قصوری کے قتل پر مامور کیا گیا تھا اور میرے ساتھ ایف، ایس، ایف کے غلام مصطفےٰ اور رانا افتخار بھی شامل تھے۔

ملزم ارشد اقبال کے بیان کے مطابق اس نے سگنل فائر کیا تھا اور رانا افتخار نے برسٹ مارا تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ احمد رضا قصوری کے بجائے ان کے والد نواب احمد خان ہلاک ہو گئے۔

ارشد اقبال کا کہنا تھا کہ مسٹر بھٹو کے وکیلوں اور ایف ایس ایف کے ڈائریکٹر آپریشنز میاں عباس نے انہیں لالچ دیا اور پھر دھمکایا اور کہا کہ مسٹر بھٹو دوبارہ برسرِ اقتدار آ جائیں گے، اگر تم نے بات نہ مانی تو تمہیں پھانسی پہ لٹکا دیا جائے گا۔ عدالت نے درخواست کی سماعت اگلے روز پہ ملتوی کر دی۔

۵ر اکتوبر کو لاہور ہائی کورٹ کے فل بنچ نے ہائی کورٹ کی موجودہ تشکیل اور دائرۂ کار کے بارے میں مسٹر بھٹو کے اعتراضات پر مشتمل درخواست کی سماعت شروع کی۔ مسٹر بھٹو کے ایک وکیل مسٹر غلام علی میمن نے لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کی تقرری کو بھی آئین سے انحراف قرار دیا اور کہا کہ لاہور ہائی کورٹ اس وقت چیف جسٹس کے بغیر ادارہ ہے جس میں مقدمے کی سماعت نہیں ہو سکتی۔

اس روز ملزم ارشد اقبال کے جواب میں مسٹر بھٹو کے وکیل قاضی سلیم نے اس کے بیانات کی تردید کی۔ عدالت نے کارروائی ۸ر اکتوبر تک ملتوی کر دی۔

ایک وضاحت

۸ر اکتوبر کو فل بنچ نے مقدمے کی کارروائی جاری رکھی اور فریقین کے دلائل سن کر بنچ نے بتایا کہ فیصلہ کل سنایا جائے گا۔ واضح رہے کہ اس تمام عرصے میں مسٹر بھٹو اگرچہ مقدمۂ قتل کے سلسلے میں ضمانت پر تھے لیکن مارشل لاء کے ضابطہ ۱۲ کے تحت انہیں ۱۷ر ستمبر کو لاڑکانہ سے صبح ۴ بجے دوبارہ گرفتار کر لیا گیا تھا۔ واضح رہے کہ مسٹر بھٹو کو ۱۳ر ستمبر کو مقدمۂ قتل کے سلسلے میں مسٹر جسٹس صمدانی نے ضمانت پر رہا کرنے کا حکم دیا تھا، چنانچہ اب تک ہم نے مقدمۂ قتل کی جو کارروائی مختصراً پیش کی ہے اس دوران میں مسٹر بھٹو جیل میں تھے، لیکن ان کی گرفتاری مقدمۂ قتل کے سلسلے میں نہیں تھی بلکہ مارشل لاء کے ضابطہ ۱۲ کے تحت تھی۔ وہ جیل ہی سے مقدمۂ قتل کی سماعت کے لیے عدالت میں لائے جاتے رہے ہیں۔

ضمانت کی منسوخی

۹ر اکتوبر کو فل بنچ نے جس میں چیف جسٹس مولوی مشتاق حسین، مسٹر جسٹس ذکی الدین پال، مسٹر جسٹس ایم ایس ایچ قریشی، مسٹر جسٹس آفتاب حسین اور مسٹر جسٹس ملک گلباز خان شامل تھے، نے حکومت کی طرف سے ضمانت کی منسوخی کے لیے دائر کی جانے والی درخواست پر فیصلہ دیا جو ۲۸ صفحات پر مشتمل تھا۔

عدالت نے ہائی کورٹ کی تشکیل، دائرۂ اختیار اور قائم مقام چیف جسٹس کے بارے میں مسٹر بھٹو اور ان کے وکلاء کے اعتراضات کو مسترد کر دیا اور قرار دیا کہ بھٹو ایک ایسے جرم کے مرتکب ہیں جس کی سزا عمر قید اور موت ہو سکتی ہے اور یہ کہ وہ قتل کے سلسلے میں براہ راست ملوث نظر آتے ہیں، چنانچہ ملزم مسٹر بھٹو کو جوڈیشل نگرانی میں جیل بھیج دیا گیا۔

اب وہ قتل کے ملزم کی حیثیت سے جیل میں تھے۔

فردِ جرم

۱۱ر اکتوبر کو فل بنچ کے سامنے نواب محمد احمد خان کے مقدمۂ قتل کی باقاعدہ سماعت شروع ہوئی اور مسٹر بھٹو، ایف ایس ایف کے ڈائریکٹر آپریشن میاں عباس، انسپکٹر غلام مصطفیٰ، سب انسپکٹر رانا افتخار اور سب انسپکٹر ارشد اقبال پر باقاعدہ فردِ جرم عائد کی گئی۔

مسٹر بھٹو کے خلاف تعزیرات پاکستان کی دفعات ۳۰۲/۱۰۹، ۳۰۱، ۳۰۷/۱۰۹، ۱۲۰ بی، ۱۰۹ کے تحت فردِ جرم عائد کی گئی جس کے مطابق انہوں نے ایف ایس ایف کے سابق ڈائریکٹر جنرل مسٹر مسعود محمود کے ساتھ مل کر مسٹر احمد رضا قصوری کے قتل کی سازش کی جس کے نتیجے میں کی گئی فائرنگ سے ان کے والد نواب محمد احمد خان جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

ملزم میاں عباس نے صحتِ جرم سے انکار کیا۔ مسٹر بھٹو نے بھی یہی مؤقف اختیار کیا۔ البتہ انسپکٹر غلام مصطفیٰ نے اگرچہ صحتِ جرم سے انکار کیا تاہم یہ کہا کہ میں نے جو کچھ کیا، افسران بالا کے دباؤ کے تحت کیا۔ ملزم رانا افتخار اور ملزم ارشد اقبال نے بھی یہ کہا کہ جو کچھ ہوا وہ ان کی مرضی کے مطابق نہیں اور انہیں افسران بالا نے ایسا کرنے پر مجبور کیا تھا۔

احمد رضا قصوری کا بیان

اسی روز احمد رضا قصوری نے اپنا بیان ریکارڈ کرانا شروع کیا، جس میں انہوں نے مسٹر بھٹو سے اپنے اختلافات پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ اس سے پہلے بھی دو بار مجھ پر حملے ہوئے تھے اور قصور میں تو میرا بازو توڑ دیا گیا تھا۔ مسٹر بھٹو کے وکیل مسٹر اعوان اور ایف ایس ایف کے افسروں کے وکیل مسٹر ارشاد احمد قریشی نے مسٹر قصوری پر جرح کی۔

مسعود محمود کا بیان

۱۸ر اکتوبر کو فل بنچ نے مقدمۂ قتل کے وعدہ معاف گواہ اور سابق ڈائریکٹر جنرل ایف ایس ایف مسٹر مسعود محمود کا بیان ریکارڈ کیا، انہوں نے تسلیم کیا کہ مسٹر بھٹو نے انہیں احمد رضا قصوری کو قتل یا زخمی حالت میں پیش کرنے کا حکم دیا تھا اور جب غلطی سے نواب احمد خان قتل ہو گئے تو بھی مسٹر بھٹو ان پر احمد رضا قصوری کے قتل کے لیے دباؤ ڈالتے رہے۔ یہ بیان ۱۹ر اکتوبر کو بھی جاری رہا اور بعد ازاں مسٹر بھٹو کے وکیل ڈی ایم اعوان کی درخواست پر کہ انہیں جرح کے لیے وقت چاہیے، سماعت چند روز کے لیے ملتوی کر دی گئی۔

۲۴ر اکتوبر سے مسٹر مسعود پر جرح شروع ہوئی، جس کے دوران انہوں نے ایف، ایس، ایف کی مزید خفیہ سرگرمیوں پر روشنی ڈالی۔

انہوں نے بتایا کہ حُروں کے خلاف آپریشن کے لیے جام صادق علی کو اسلحہ مہیا کیا گیا تھا۔ مسٹر بھٹو نے اپنی خصوصی ہدایات کو خفیہ مشن کا نام دے رکھا تھا اور ہمیں غیر قانونی احکامات کی مجبوراً تعمیل کرنا پڑتی تھی۔

جرح کے جواب میں انہوں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ ایف، ایس، ایف کے ذریعے اپوزیشن کے جلسے درہم برہم کرائے جاتے تھے۔

۲۵ر اکتوبر کو بھی مسٹر مسعود محمود پر جرح ہوئی اور انہوں نے بتایا کہ احمد رضا قصوری کو ٹھکانے لگانے کا منصوبہ مسٹر بھٹو اور ان کے پیشرو حق نواز ٹوانہ نے بنایا تھا۔

۲۶ر اکتوبر کو وکیل صفائی کی جرح کے سلسلے میں مسعود محمود نے مزید سوالوں کے جواب دیے اور بتایا کہ الیکشن جیتنے کے لیے تیز رفتار گاڑیوں کا حکم بھی مسٹر بھٹو نے دیا تھا۔ یہ جرح ۲۹ر اکتوبر کو بھی جاری رہی —— مسٹر مسعود محمود نے دعویٰ کیا کہ انہوں نے رضاکارانہ طور پر وعدہ معاف گواہ بننا قبول کیا اور یہ کہ بھٹو کے دور میں وہ ہائی بلڈ پریشر اور دل کے مرض میں مبتلا ہو گئے تھے، کیونکہ ان پر شدید دباؤ تھا۔

سعید احمد خاں کا بیان

۳۰ر اکتوبر کو مسٹر مسعود محمود پر جرح مکمل ہوئی اور مسٹر بھٹو کے سابق چیف سیکورٹی آفیسر مسٹر سعید احمد خان کا بیان شروع ہوا، انہوں نے تسلیم کیا کہ مسٹر بھٹو نے انہیں اپوزیشن اور پیپلز پارٹی کے باغیوں کی فائلیں کھولنے کو کہا تھا، نیز احمد رضا قصوری کی نگرانی اور فون ٹیپ کرنے کا حکم بھی دیا تھا۔

انہوں نے یکم نومبر کو فل بنچ کے سامنے اپنا بیان قلم بند کرواتے ہوئے مزید کہا کہ محمد احمد خان کے قتل میں استعمال ہونے والے اسلحے کو اسمگل شدہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی، حالانکہ یہ وہی اسلحہ تھا جو فیڈرل سیکورٹی استعمال کرتی تھی۔ مسٹر سعید احمد خان نے بتایا کہ مسٹر بھٹو کا حکم تھا کہ اس سلسلے میں ایف ایس ایف کا نام نہ آنے پائے اور نواب احمد خان کے قتل کے بارے میں لاہور ہائی کورٹ میں مسٹر جسٹس شفیع الرحمان کی سربراہی میں جو ٹریبونل قائم ہوا تھا اس کے متعلق وہ یعنی سعید احمد خان یہ پیغام لے کر مسعود محمود کے پاس گئے تھے کہ سابق وزیراعظم چاہتے ہیں کہ ٹریبونل کے سامنے ایسی شہادتیں فراہم کی جائیں جن سے پتہ چل سکے کہ مسٹر قصوری کی بہت سے لوگوں سے خاندانی دشمنی تھی۔

مسٹر سعید احمد خان نے یہ بھی کہا کہ مسٹر بھٹو نے انہیں دھمکی دی تھی کہ وہ عبرت ناک سزا دیں گے جسے میری آنے والی نسلیں بھی یاد رکھیں گی، اگر میں نے ان کی بات نہ مانی۔ اس روز کے بعد سماعت چند روز کے لیے ملتوی کر دی گئی۔

۵ر نومبر کو سماعت دوبارہ شروع ہوئی جس میں سعید احمد خان نے بتایا کہ مسٹر بھٹو نے نواب احمد خان کے مقدمۂ قتل کے متعلق ٹریبونل کی رپورٹ شائع کرنے سے روک دیا تھا، نیز یہ کہ سعید احمد خان نے احمد رضا قصوری کو اپنی جان بچانے کے لیے پیپلز پارٹی میں شامل ہو جانے کا مشورہ دیا تھا۔

بھٹو کے وکیل مسٹر ڈی ایم اعوان نے اسی روز عدالت کو ایک تحریری درخواست بھی دی جس کے مطابق قائم مقام چیف جسٹس نے بی بی سی کے نمائندے مارک ٹیلی سے جو گفتگو کی تھی اس کے مطابق موجودہ عدالت پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ قائم مقام چیف جسٹس نے درخواست کو ریکارڈ میں شامل کرنے کی اجازت دے دی۔

۶، اور ۷، نومبر کو بھی سعید احمد خان پر جرح جاری رہی۔ سپیشل پبلک پراسیکیوٹر ایم انور نے عدالت کو بتایا کہ یکم اپریل ہی سے مسٹر بھٹو نے اہم سرکاری کاغذات غائب کرنا شروع کر دیئے تھے۔

برطانوی وکیل کی آمد

۸ر نومبر کو لاہور ہائی کورٹ کے قائم مقام چیف جسٹس مولوی مشتاق حسین نے برطانوی وکیل مسٹر چارلس میتھوس کو بتایا کہ پاکستان میں رائج قانون کے مطابق وہ مسٹر بھٹو کی وکالت کے فرائض انجام نہیں دے سکتے، کیونکہ کوئی شخص بار کونسل کا اس وقت تک رکن نہیں بن سکتا جب تک اسے پاکستان میں قیام کیے ہوئے ایک سال کا عرصہ نہ گزر گیا ہو۔ اس پر مسٹر میتھوس نے کہا وکیلِ صفائی کی حیثیت سے مسٹر ڈی ایم اعوان بہتر طور پر فرائض انجام دے رہے ہیں۔ البتہ وہ صرف اس لیے پاکستان آئے ہیں کہ مسٹر بھٹو سے مل سکیں اور انہیں قانونی مشورہ دے سکیں۔

واضح رہے کہ کسی غیر ملکی وکیل کے لیے پاکستان میں قیام کی شرط مسٹر بھٹو کے دور میں لگائی گئی تھی، جس کی وضاحت جرح کے دوران مسٹر سعید احمد خان کے حوالے سے یہ سامنے آئی کہ مسٹر بھٹو کو خوف تھا کہ کالعدم نیپ اپنے مقدمے کے لیے کسی غیر ملکی قانون دان کو بلانے میں کامیاب نہ ہو جائے۔

عدالت نے مسٹر میتھوس کو مسٹر بھٹو سے ملنے کی اجازت دے دی۔

"فیصلہ اسلامی اصولوں کے مطابق ہونا چاہیے" احمد رضا قصوری

۱۳ نومبر کو سپیشل پراسیکیوٹر مسٹر ایم انور کا انتقال ہو گیا، اسی روز فل بنچ کے سربراہ اور قائم مقام چیف جسٹس مولوی مشتاق حسین نے مقدمے کی سماعت دو روز کے لیے ملتوی کر دی کیونکہ مسٹر بھٹو کے وکیل نے کہا تھا کہ ان کے موکل کی طبیعت ناساز ہے۔

مسٹر ویلیچ کا بیان

۱۴ نومبر کو فل بنچ کے سامنے کوئٹہ میں ڈائریکٹر ایف ایس ایف مسٹر ویلچ نے اپنا بیان قلمبند کرایا اور اسی روز وکلا صفائی نے ان پر جرح مکمل کر لی۔ مسٹر ویلچ کا کہنا تھا کہ مسٹر مسعود محمود نے مجھے احمد رضا قصوری کو ٹھکانے لگانے کا حکم دیا تھا۔ نیز یہ کہ ان کا کام سیاسی جماعتوں اور لیڈروں پر کڑی نظر رکھنا تھا، تاہم وہ ایسے گھناؤنے جرم سے متفق نہ تھے۔ لہٰذا وہ اس حکم کو گول کر گئے۔

۱۷ نومبر کو استغاثہ کے چوتھے گواہ مسٹر مسعود محمود کے پرائیویٹ سیکرٹری احمد نواز قریشی کا بیان قلمبند کیا گیا۔

ڈاکٹروں کے بیانات

۱۹ نومبر کو فل بنچ نے ڈاکٹر آصف لودھی اور ڈاکٹر صابر علی کے بیانات قلمبند کیے جنہوں نے نواب محمد احمد خان کی لاش کا پوسٹمارٹم کیا تھا۔ ڈاکٹروں پر مسٹر بھٹو کے وکلائے جرح بھی کی۔ اسی روز گلبرگ تھانہ کے اسسٹنٹ سب انسپکٹر محمد بشیر کا بیان بھی قلمبند کیا گیا۔

مجسٹریٹوں کے بیانات

۲۰ نومبر کو ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مسٹر اقبال ندیم اور ایک مجسٹریٹ مسٹر ذوالفقار علی طور نے اپنے بیانات قلمبند کرائے۔ مسٹر ندیم نے بتایا کہ مسٹر مسعود محمود اور ملزم غلام حسین کی طرف سے سلطانی گواہ بننے کی درخواستیں مجھے موصول ہوئی تھیں اور انہوں نے بتایا تھا کہ ان پر کسی نے دباؤ نہیں ڈالا بلکہ وہ اپنی مرضی سے سلطانی گواہ بننا چاہتے ہیں۔

مسٹر طور نے عدالت کو بتایا کہ اس مقدمۂ قتل میں سلطانی گواہوں مسٹر مسعود محمود اور غلام حسین سمیت میاں محمد عباس، غلام مصطفیٰ، رانا افتخار اور ارشد اقبال نے میرے سامنے اپنے بیانات قلمبند کرائے تھے اور کہا تھا کہ ان پر کوئی دباؤ یا تشدد نہیں۔ مسٹر بھٹو کے وکلائے مجسٹریٹوں پر بھی جرح کی۔

جیل سے باہر نماز

۲۱ نومبر کو فل بنچ نے مسٹر بھٹو کی جیل سے باہر نماز عید ادا کرنے کی درخواست مسترد کر دی اور کہا کہ ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ مقدمۂ قتل میں ملوث ملزم کو ضمانت کے بغیر جیل سے باہر آنے کی اجازت دی گئی ہو۔

ایس پی اصغر خان کا بیان

۲۶ نومبر کو لاہور کے سابق سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر اصغر خان المعروف ہلاکو خان اور تھانہ گلبرگ کے سابق ایس ایچ او راجہ عبدالعزیز کے بیانات قلمبند کیے گئے۔ مسٹر اصغر خان نے اپنے بیان میں بتایا کہ نواب احمد خان کے قتل کے اگلے روز مجھ پر دباؤ ڈالا گیا تھا کہ میں نواب احمد خان کی لاش چھین کر کسی دوسری جگہ دفن کر دوں۔ گواہ نے یہ شکایت بھی کی کہ مسٹر بھٹو کی طرف سے تفتیش میں اس قدر دخل اندازی کی گئی کہ ہم آزادانہ طور پر اپنا کام نہ کر سکے۔

۲۷ نومبر کو جرح کے جواب میں مسٹر اصغر خان نے کہا کہ وہ یا ان کا کوئی ماتحت اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ سابق وزیر اعظم کے خلاف تفتیش کر سکتے۔

مسٹر بھٹو کا طبّی معائنہ

اسی روز فل بنچ کے روبرو سپیشل پبلک پراسیکیوٹر نے بتایا کہ مسٹر بھٹو نے ڈاکٹروں کے اس بورڈ سے بھی معائنہ کرانے سے انکار کر دیا، جو عدالت نے تجویز کیا تھا۔ اس پر عدالت نے مسٹر بھٹو کے وکیل کو ہدایت کی کہ وہ معلوم کر کے بتائیں کہ مسٹر بھٹو کب عدالت میں پیش ہو سکیں گے۔ کیونکہ عدالت کی رائے میں مسٹر احمد رضا قصوری پر باقی ماندہ جرح مسٹر بھٹو کی موجودگی میں کی جائے گی اور اسے غیر معینہ مدّت کے لیے ملتوی نہیں کیا جا سکتا۔ مسٹر بھٹو کے وکلائے بھی پولیس افسروں پر جرح کی۔

سردار عبدالوکیل کا بیان

۲۸ نومبر کو فل بنچ کے سامنے سابق ڈی آئی جی لاہور سردار عبدالوکیل خان نے بیان دیا کہ نواب احمد خان کے قتل کے وقوع میں استعمال ہونے والی گولیوں کو مرحوم پولیس افسر مسٹر عبدالحمید باجوہ وزیر اعظم ہاؤس لے گئے اور وقوعہ کے اگلے روز اعلیٰ پولیس افسروں کے اجلاس میں لاش چھین لینے کی بات ہوئی تھی۔ گواہ پر ملزموں کے وکلاء نے بھی جرح کی۔

ملک وارث شاہ کا بیان

۲۹ نومبر کو فل بنچ کے سامنے سی آئی اے شاخ کے سابق ڈی ایس پی ملک وارث نے بیان دیا کہ نواب احمد خان کے مقدمۂ قتل میں انہیں آزادانہ تفتیش کی اجازت نہ تھی اور اعلیٰ پولیس افسروں نے انہیں چیف سیکورٹی افسر مسٹر سعید احمد خان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا جو تفتیش کی خود نگرانی کرتے تھے۔ ان پر جرح اسی روز شروع ہوئی جو ۳۰ نومبر کو بھی جاری رہی۔ ۲ دسمبر کو فل بنچ نے تھانہ اچھرہ کے دو اہلکاروں محمد مسعود اور محمد اکرام کے بیان لئے اور ان پر جرح ہوئی۔ اسی روز قتل میں ملوث ملزم غلام مصطفےٰ کے ڈرائیور محمد امیر نے بھی اپنا بیان ریکارڈ کروایا۔

احمد رضا قصوری کی آمد

۷ دسمبر کو فل بنچ کے سامنے استغاثہ کے پہلے گواہ اور مقتول کے صاحبزادے مسٹر احمد رضا قصوری پر دوبارہ جرح ہوئی جس میں مسٹر قصوری نے کہا کہ ان کے والد کے مقدمۂ قتل کا فیصلہ اسلامی اصولوں کے مطابق ہونا چاہیئے۔ اسی روز ایف ایس ایف کے ڈپٹی ڈائریکٹر میر بادشاہ کا بیان بھی قلم بند کیا گیا۔

مزید گواہوں پر جرح

۸ دسمبر کو فل بنچ کے سامنے مسٹر میر بادشاہ کے علاوہ مسٹر مسعود محمود کے ڈرائیور منظور حسین، قومی اسمبلی سیکرٹریٹ کے اسسٹنٹ سیکرٹری مسٹر عبدالرشید اور اسلام آباد پولیس کے انسپکٹر مسٹر ناصر نواز شاہ آئے۔ اسسٹنٹ سیکرٹری نے قومی اسمبلی میں مسٹر قصوری کی مختلف تحریکوں کا ریکارڈ پیش کیا اور مسٹر ناصر نواز نے ۲۴ اگست ۷۴ء کو مسٹر قصوری پر ہونے والی فائرنگ کا واقعہ بیان کیا۔ مقدمے کی سماعت چند روز کے لیے ملتوی کر دی گئی۔

اسلحہ انچارج کا بیان

۱۲ دسمبر کو فل بنچ کے سامنے ایف ایس ایف کے ہیڈ کوارٹر میں متعین اسلحہ انچارج فضل علی اور انٹیلی جنس اسسٹنٹ ڈائریکٹر اعجاز الحسین کے بیانات ہوئے۔ فضل علی نے عدالت کو بتایا کہ انہوں نے ڈائریکٹر آپریشن میاں محمد عباس ملزم کے حکم سے ۹ مئی کو وعدہ معاف گواہ انسپکٹر غلام حسین کو ۱۵۰ سو راؤنڈ پر مشتمل اسلحہ فراہم کیا تھا۔ دونوں گواہوں سے سوالات بھی کیے گئے۔

انسپکٹر غلام حسین کا بیان

۱۴ دسمبر کو فل بنچ کے سامنے وعدہ معاف گواہ انسپکٹر غلام حسین پیش ہوئے اور یہ بیان دیا کہ ایف ایس ایف کے سابق ڈائریکٹر میاں محمد عباس نے احمد رضا خان قصوری کے قتل کا حکم دیا تھا۔ گواہ نے بتایا کہ مسٹر احمد رضا قصوری پر ۲۴ اگست ۷۴ء کو جو حملہ اسلام آباد میں ہوا وہ اس میں بھی ملوث تھا۔ استغاثہ کے دیگر گواہوں عاشق لودھی، اسسٹنٹ ڈائریکٹر ایف ایس ایف اور ہارون احمد، سیکشن افسر اسٹیبلیمنٹ ڈویژن اسلام آباد پر جرح بھی مکمل کر لی گئی۔

انسپکٹر غلام حسین کا بیان ۱۵ دسمبر کو بھی جاری رہا۔ جس میں انہوں نے کہا کہ ملزم رانا افتخار نے میری نگرانی میں احمد رضا قصوری کی کار پر فائرنگ کی تھی۔

ایک روز کے وقفے کے بعد ۱۷ دسمبر کو بھی گواہ غلام حسین کا بیان جاری رہا۔ جس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اسلام آباد میں ایف ایس ایف کے تربیتی مرکز میں دھماکے کرنے اور گھات لگانے کی تربیت دی تھی۔ نیز احمد رضا قصوری پر حملے کے لیے میاں محمد عباس کی طرف سے بار بار دباؤ ڈالا گیا تھا۔

۱۸ دسمبر کو انسپکٹر غلام حسین پر جرح ہوئی۔ اسی روز مقدمۂ قتل کی سماعت ۹ جنوری تک کے لیے ملتوی کر دی گئی۔

مسٹر بھٹو کا بائیکاٹ

تین ہفتے بعد فل بنچ نے ۹ جنوری کو نواب احمد خاں کے قتل کے سلسلے میں مقدمے کی سماعت شروع کی تو مسٹر بھٹو نے مقدمۂ قتل کی کارروائی سے لاتعلقی کا اظہار کر دیا۔ ان کے وکیل مسٹر ڈی ایم اعوان نے عدالت کو بتایا کہ وقفے کے دوران میں ان کے موکل مسٹر بھٹو نے ایک خط کے ذریعے میرے سمیت تمام وکلاء پر عدم اعتماد کا اظہار کیا ہے اور موکل نے ان سے وکالت کے اختیارات واپس لے لیے ہیں، لہٰذا وہ مسٹر بھٹو کے مقدمے کی پیروی کرنے کے مجاز نہیں رہے۔

فاضل عدالت نے مسٹر بھٹو کے وکلاء مسٹر اعوان اور احسان قادر کو ہدایت کی کہ وہ سرکاری خرچ پر مسٹر بھٹو کے مقدمے کی پیروی کریں، لیکن مسٹر بھٹو نے کہا کہ میں نے وکیل کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں دی۔ مسٹر بھٹو کے وکلاء نے اس سلسلے میں معذرت کی اور میاں عباس کے وکیل مسٹر قربان صادق اکرام نے گواہ غلام حسین پر جرح شروع کی۔

۱۰ جنوری کو اس کیس کے سلسلے میں فاضل عدالت نے قرار دیا کہ مسٹر بھٹو کو قانونی امداد کی ضرورت نہیں تو عدالت اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتی۔ اگر مسٹر بھٹو اپنے وکلاء کے وکالت نامے منسوخ کر کے سنسنی پیدا کرنا چاہتے ہیں تو عدالت اس سلسلے میں کیا کر سکتی ہے۔ واضح رہے کہ ایک روز قبل عدالت نے مسٹر بھٹو کے وکلاء کو پیشکش کی تھی کہ اگر وہ چاہیں تو سرکاری خرچ پر وکالت کے فرائض انجام دے سکتے ہیں، لیکن کمرہ عدالت میں دونوں وکلاء نے دستبردار ہونے کی اجازت چاہی۔

وعدہ معاف گواہ انسپکٹر غلام حسین کا بیان اس دن بھی جاری رہا۔ جس میں اس نے وضاحت کی کہ شیعہ سُنی فسادات کرانے کے لیے ریٹائرڈ جج جسٹس جمیل حسین رضوی کو بھی ٹھکانے لگانے کا حکم دیا گیا تھا۔ میاں محمد عباس کے وکیل قربان صادق اکرام نے گواہ پر جرح شروع کی۔ انسپکٹر غلام حسین نے یہ بھی بتایا کہ اداکار محمد علی پر حملہ بھی ایف ایس ایف نے کرایا تھا۔

چیف جسٹس کو دھمکی

۱۱ جنوری کو فل بنچ کے روبرو وعدہ معاف گواہ انسپکٹر غلام حسین نے غلطی سے مسٹر جمیل حسین رضوی کے لیے جسٹس کی بجائے لفظ چیف جسٹس استعمال کیا۔ چیف جسٹس نے جو بنچ میں شامل تھے، گواہ سے کہا کہ لفظ جج استعمال کریں، کیونکہ اس وقت تک چیف جسٹس کی باری نہیں آئی تھی، انہوں نے یہ بات ہنستے ہوئے کہی۔

اس موقع پر مسٹر بھٹو نے اپنی نشست سے کہا کہ "یہ بھی آ جائے گی"۔ یہ ریمارک سننے کے بعد قائم مقام چیف جسٹس نے عدالت میں موجود ایس پی کو حکم دیا کہ وہ ان الفاظ کو نوٹ کرے اور قریب ترین پولیس سٹیشن میں ریکارڈ کرائے، کیونکہ اس سے ان کے الفاظ سے ان کو ٹھیس نہیں پہنچی۔ کیونکہ وہ اس لیے کہہ رہے ہیں کہ اگر ایسی صورت پیش آ ہی جائے تو کسی کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا جائے۔

اسی شام پرانی انارکلی پولیس نے مسٹر بھٹو کے محافظ ایس پی کی طرف سے یہ رپورٹ درج کی۔

جس میں کہا گیا کہ مسٹر بھٹو نے "آج نواب محمد احمد خان کے مقدمۂ قتل کی سماعت کے دوران قائم مقام چیف جسٹس کے بارے میں ایسے الفاظ استعمال کیے، جنہیں دھمکی کہا جا سکتا ہے"۔

اس روز مسٹر بھٹو نے فاضل عدالت کو بتایا کہ وہ اس مقدمے سے مکمل طور پر لاتعلق ہو گئے ہیں۔ یہ بات انہوں نے فاضل عدالت کے اس استفسار پر بتائی کہ کیا وہ آرمامنٹ کے ڈپٹی چیف انسپکٹر کرنل زوار حسین کے بیان پر جرح کرنا پسند کریں گے۔ آرمامنٹ کے انسپکٹر میجر محمد سرفراز نعیم نے بھی استغاثہ کے گواہ کی حیثیت سے اپنا بیان قلمبند کرایا۔

پولیس افسروں کے بیانات

۱۴ جنوری کو اچھرہ تھانہ کے سابق ایس ایچ او عبدالحئی نیازی فل بنچ کے سامنے پیش ہوئے۔ علاوہ ازیں اس مقدمۂ قتل کے ایک اقبالی ملزم مسٹر ارشد اقبال کی طرف سے مسٹر ارشاد احمد قریشی کی بجائے چوہدری محمد ظفر نے وکالت نامہ پیش کیا۔

۱۵ جنوری کو بھی پولیس افسر عبدالحئی نیازی پر جرح ہوئی اور ان کا کہنا تھا کہ زبردست سرکاری دباؤ کی وجہ سے اس قتل کیس کی تفتیش آزادانہ نہ ہو سکی۔ ۱۷ جنوری کو چیف جسٹس مسٹر مشتاق حسین نے پنجاب ہائیکورٹ کے چیف جسٹس کے عہدے کا حلف اٹھایا، اس سے پہلے وہ قائم مقام کے عہدے پر کام کر رہے تھے۔ اسی روز فل بنچ کے سامنے ہوم سیکرٹری پنجاب کے پرائیویٹ سیکرٹری محمد اکرم واجد اور ماہر اسلحہ نادر حسین عابدی کے بیانات قلمبند کیے گئے۔ عدالت میں شفیع الرحمان ٹربیونل کا ریکارڈ بھی پیش ہوا۔

۱۷ جنوری کو ایف آئی اے کے ڈپٹی ڈائریکٹر نادر حسین عابدی اور اسلام آباد پولیس کے ہیڈ کانسٹیبل مسٹر عبدالرؤف اور ایف آئی اے کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر مسٹر احمد سعید پیش ہوئے۔ ان پر وکلاء نے جرح بھی کی۔ ان کا تعلق ایف آئی اے کے ٹیکنیکل ونگ سے تھا۔

۱۸ جنوری کو فل بنچ کے سامنے ایف آئی اے کے انسپکٹر محمد بوٹا نے بیان ریکارڈ کرایا جس کا کہنا تھا کہ وعدہ معاف گواہ غلام حسین کو نہ تو شاہی قلعہ لے جایا گیا اور نہ اذیت دی گئی۔ مسٹر بھٹو نے اس دوران میں کسی گواہ پر جرح نہ کی۔

اب تک کا خلاصہ

۱۸ جنوری تک نواب احمد خاں قتل کیس میں استغاثہ کی طرف سے صرف دو گواہ باقی رہ گئے تھے اور ۴۸ گواہ پیش ہو چکے تھے، استغاثہ کی طرف سے ۴۲ گواہوں کی فہرست پیش کی گئی تھی۔ لیکن چالیس گواہوں کے بعد باقی شہادتیں ترک کر دی گئی ہیں، ایف ایس ایف کے سابق ڈائریکٹر مسعود محمود اور انسپکٹر غلام حسین وعدہ معاف گواہ تھے، باقی تین ملزم صوفی غلام مصطفیٰ، رانا افتخار اور ارشد اقبال اقبالی ملزم تھے اور مسٹر بھٹو اور میاں محمد عباس نے جرم کے ارتکاب سے یکسر انکار کیا تھا۔ مسٹر بھٹو نے مقدمے سے لاتعلقی کا اظہار کر دیا تھا اور اپنے وکیلوں کو دستبرداری کی ہدایت کی تھی۔

آخری چند گواہ

مسٹر بھٹو نے عدالت کی کارروائی کا بائیکاٹ کر دیا

۱۲ جنوری کو مقدمہ قتل کی تفتیشی ٹیم کے سربراہ اور ایف آئی اے کے ڈپٹی ڈائریکٹر عبدالخالق کا بیان قلمبند کیا گیا اور ایف آئی اے کے انسپکٹر محمد اسلم سابی بھی بطور گواہ پیش ہوئے۔ معلوم یہ ہوا ہے کہ غیر قانونی سرگرمیوں کے لیے اسلحہ ایف ایس ایف کی چھیوں پر مہیا کیا جاتا تھا۔ مسٹر عبدالخالق نے بیان کیا کہ تفتیش کے دوران مسٹر بھٹو قتل میں ملوث پائے گئے ہیں۔ اسی روز مسٹر بھٹو نے جو عدالت میں موجود تھے، ایف آئی اے کے ڈپٹی ڈائریکٹر عبدالخالق کے متعلق کہا کہ تفتیش کے دوران مجھے بھی دھمکیاں دی گئی تھیں۔

۲۲ جنوری کو استغاثہ کے گواہ مجسٹریٹ ذوالفقار علی طور کا ایک ضمنی بیان قلمبند کیا گیا۔

محمد حنیف رامے کی "ساز باز"

۲۳ جنوری کو فل بنچ کے سامنے سپیشل پبلک پراسیکیوٹر مسٹر ایم اے رحمان نے بتایا کہ اس مقدمہ قتل میں سابق وزیر اعلیٰ محمد حنیف رامے کی شہادت ترک کر دی گئی ہے، کیونکہ ان کے بقول حنیف رامے نے ساز باز کر لی تھی۔ ایک اور خاتون گواہ ڈاکٹر زرین فیض کو بھی ترک کر دیا گیا، کیونکہ وہ پاکستان سے باہر تھیں۔ استغاثہ کے باقی ۲۹ گواہوں کو غیر ضروری قرار دے کر چھوڑ دیا گیا۔

چند روز بعد مسٹر حنیف رامے نے سپیشل پبلک پراسیکیوٹر کے خلاف عدالت میں یہ درخواست دی کہ ان کے بارے میں غلط بیانی کی گئی ہے اور انہوں نے کوئی ساز باز نہیں کی، بلکہ سپیشل پبلک پراسیکیوٹر کی مرضی کا بیان دینے سے انکار کیا۔

مسٹر بھٹو نے کہا

۲۴ جنوری کو مسٹر بھٹو نے ۳۴۲ ضابطہ فوجداری کے تحت اپنی صفائی پیش کرنے سے انکار کر دیا اور فاضل عدالت کو بتایا کہ میں نے کارروائی کا بائیکاٹ کر دیا ہے، کیونکہ میں نے ۱۸ اور ۲۲ دسمبر کو دو درخواستیں دی تھیں جو فاضل بنچ نے اپنے چیمبر ہی میں مسترد کر دیں۔ البتہ میں دو نکات پر اپنی پوزیشن واضح کروں گا کہ میرے خلاف یہ مقدمہ کیوں گھڑا گیا اور حصولِ انصاف میں عدمِ اعتماد کے باعث میں نے مقدمے کا کیوں بائیکاٹ کیا۔

مسٹر بھٹو نے کہا میں عدالت کے ان سوالات کا جواب دوں گا، جو براہ راست میری صفائی کے متعلق نہ ہوں گے۔ مسٹر بھٹو نے اکثر سوالوں کے جواب میں یہ لفظ استعمال کیا "وہی جواب"، ان کا مقصد یہ تھا کہ میں اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہوں گا۔

بند کمرے میں سماعت

۲۵ جنوری کو فل بنچ نے بند کمرے میں سماعت کی۔

——— مسٹر یحییٰ بختیار نے مسٹر بھٹو سے عدالت سے اجازت لے کر ساڑھے تین گھنٹے تک ملاقات کی۔ مسٹر یحییٰ بختیار کے مطابق وہ کارروائی کا ایک لفظ بھی جو مسٹر بھٹو نے انہیں بتایا پریس میں اشاعت کے لیے نہیں دے سکتے۔ کیونکہ فاضل عدالت نے انہیں منع کیا ہے۔

بند کمرے میں اگلی سماعت ۲۸ جنوری کو ہوئی۔ مسٹر بھٹو نے اپنے وکلا یحییٰ بختیار اور ڈی ایم اعوان سے ملاقات کی۔

میاں محمد عباس کا بیان

۲۹ جنوری کو فل بنچ نے مقدمہ قتل کے ملزم ایف ایس ایف کے سابق ڈائریکٹر آپریشن میاں محمد عباس کا بیان بھی بند کمرے میں ریکارڈ کیا۔

ہائیکورٹ میں ہنگامہ

۳۱ جنوری کو فل بنچ نے فیصلہ دیا کہ آئندہ تمام کارروائی بند کمرے میں ہوگی۔ کیونکہ مقدمے کے بڑے ملزم مسٹر زیڈ اے بھٹو کے حامیوں نے چیف جسٹس کے کمرے کے سامنے ہنگامہ آرائی کی تھی۔ البتہ یہ واضح کیا گیا کہ کارروائی کی تفصیل بعد ازاں اخبارات کو مہیا کی جائے گی۔ ملزم میاں محمد عباس نے اپنا بیان ریکارڈ کرایا اور ان پر جرح بھی ہوئی۔ یہ کارروائی یکم فروری کو بھی جاری رہی اور ایف ایس ایف کے سابق انسپکٹر ملزم غلام مصطفےٰ نے احمد رضا قصوری کو قتل کرنے کی سازش میں ملوث ہونے کا اعتراف کیا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ مصطفےٰ کھر اور ایکٹر محمد علی پر فائرنگ کے لئے بھی ایف ایس ایف کی ٹیم بھیجی گئی تھی اور ایف ایس ایف کو چوہدری ظہور الٰہی اور حنیف رامے کی پٹائی کرنے پر بھی مامور کیا گیا تھا۔

دو مزید ملزموں کا اعتراف

۲ فروری کو فل بنچ کے سامنے ایف ایس ایف کے دو سابق افسروں ملزم ارشد اقبال اور ملزم رانا افتخار نے قتل کی سازش میں ملوث ہونے کا اعتراف کیا۔ سوالوں کے جواب میں یہ دعوے بھی سامنے آئے کہ مولانا مودودی کی اقامت گاہ کو اڑانے، مصطفےٰ کھر کو قتل کرنے، راولپنڈی میں مولانا غلام اللہ کی مسجد میں بم پھینکنے اور سیالکوٹ میں ملک سلیمان کی کار کو آگ لگانے کے کام بھی ان کو سونپے گئے تھے۔

۱۰ فروری کو فل بنچ کے سامنے محمد امین ڈپٹی سیکرٹری وزارتِ داخلہ، مسٹر عبدالمجید ڈی ایس پی سپیشل سیل وزارت داخلہ اور عبدالخالق ڈپٹی ڈائریکٹر ایف آئی اے لاہور پیش ہوئے۔ تینوں گواہوں کو بطور صفائی پیش کیا گیا۔ مسٹر بھٹو نے کوئی جرح نہ کی البتہ سپیشل پبلک پراسیکیوٹر ایم اے رحمان نے ان پر جرح کی۔ آئندہ سماعت ۱۳ فروری تک ملتوی کر دی گئی۔

ملزموں کے وکیل کے دلائل

۱۳ فروری کو ایف ایس ایف کے تینوں ملزموں ارشد اقبال، غلام مصطفےٰ اور رانا افتخار کے وکیل ارشاد احمد قریشی نے یہ موقف اختیار کیا کہ ان تینوں جونیئر افسروں نے محض ایف ایس ایف ایکٹ کی تعمیل کی ہے۔ انہیں احمد رضا قصوری یا ان کے والد سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ انہوں نے اپنے اعلیٰ افسروں مسعود محمود اور میاں عباس کے احکامات کی تعمیل کی اور سابق وزیر اعظم بھی اس قتل میں ملوث تھے۔

میاں محمد عباس کے وکیل کے دلائل

۱۴ فروری کو ایف ایس ایف کے سابق ڈائریکٹر آپریشن ملزم میاں محمد عباس کے وکیل مسٹر قربان صادق اکرام نے اپنے دلائل پیش کیے۔

۱۵ فروری کو بھی یہ دلائل جاری رہے۔ دلائل کا خلاصہ یہ تھا کہ اب تک جو ریکارڈ پیش کیا گیا اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ میاں محمد عباس اس سازش میں شریک تھے۔ نیز وعدہ معاف گواہ مسٹر مسعود محمود ۵ جولائی سے نظر بند ہیں لہٰذا ان کا بیان ایک آزاد شخص کا بیان تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ نیز پولیس افسروں نے کسی جگہ بھی میاں محمد عباس کا نام نہیں لیا۔

۱۸ فروری کو فل بنچ نے قتل کیس کی سماعت ۲۱ فروری تک ملتوی کر دی، کیونکہ مقدمہ کے مرکزی ملزم مسٹر بھٹو انفلوئنزا ہونے کے باعث عدالت میں نہ آ سکتے تھے۔

۲۱ فروری کو بھی یہ دلائل جاری رہے، اور ۲۲ فروری کو مسٹر قربان صادق اکرام نے اپنے موکل میاں عباس کی صفائی میں دلائل دیے۔ یہ دلائل ۲۵ فروری کو مکمل ہوئے اور استغاثہ کی طرف سے سپیشل پبلک پراسیکیوٹر مسٹر اعجاز حسین بٹالوی کی باری آئی۔ ملزم میاں عباس کے وکیل صفائی مسٹر

قربان صادق اکرام نے اپنے دلائل کے سلسلے میں فاضل چیف جسٹس اور فل بنچ کے ججوں کا شکریہ ادا کیا کہ انہیں پورا موقع دیا گیا۔

سماعت مکمل، فیصلہ محفوظ

۲، مارچ کو لاہور ہائیکورٹ کے فل بنچ نے نواب محمد احمد خان قتل کیس کی سماعت مکمل کر لی، فل بنچ میں چیف جسٹس مشتاق حسین مسٹر جسٹس ذکی الدین پال، مسٹر جسٹس ایم ایس ایچ قریشی، مسٹر جسٹس آفتاب حسین، مسٹر جسٹس گلباز خان شامل تھے۔ مقدمۂ قتل کے ملزمان میں سابق وزیراعظم مسٹر بھٹو، سابق ڈائریکٹر ایف ایس ایف میاں محمد عباس اور ایف ایس ایف کے تین جونیئر افسر غلام مصطفےٰ، ارشد اقبال اور رانا افتخار شامل ہیں۔ وعدہ معاف گواہ ایف ایس ایف کے ڈائریکٹر جنرل مسعود محمود اور انسپکٹر غلام حسین ہیں۔ استغاثہ کی طرف سے ۴۲ افراد کی شہادتیں قلمبند کی گئیں۔ صفائی کی طرف سے چار شہادتیں پیش ہوئیں۔ مسٹر بھٹو کے وکلاء مسٹر ڈی ایم اعوان اور احسان قادر تھے، بعد میں مسٹر بھٹو نے مقدمے کی کارروائی سے قطع تعلق کر لیا اور ان وکلاء کے وکالت نامے منسوخ کر دیے۔ ملزم میاں محمد عباس کی طرف سے مسٹر قربان صادق اکرام اور تین جونیئر افسروں غلام مصطفےٰ، ارشد اقبال اور رانا افتخار کی طرف سے مسٹر ارشاد احمد قریشی بطور وکیل پیش ہوئے۔ تمام کارروائی کو ٹیپ کیا گیا اور آخری چند سماعتیں بند کمرے میں ہوئیں۔ استغاثہ کی طرف سے پہلے پبلک پراسیکیوٹر ایم انور تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے نائب مسٹر ایم اے رحمان اور آخر میں مسٹر اعجاز حسین بٹالوی نے یہ فرائض سرانجام دیے۔

فیصلے کا اعلان کسی بھی وقت متوقع ہے۔

کوئٹہ

نمائندہ صحافت

جمعیت طلباء اسلام کے ملک سکندر خان خلیل کہتے ہیں

الحاد نہیں۔ اسلام چلے گا

ملک سکندر خان علیی خیل ان دنوں جمعیت طلباء اسلام بلوچستان کے صدر ہیں۔ دراز قد کے یہ نوجوان ۱۹۷۱ء میں جمعیت طلباء اسلام میں شامل ہوئے، پولی ٹیکنیک میں ڈپلومہ حاصل کیا۔ ان دنوں لاء کالج میں داخلہ لینے کے خواہشمند ہیں۔ ۱۹۷۶ء سے صوبائی صدر کی حیثیت سے بلوچستان کے طلبہ میں کام کر رہے ہیں۔ ۲۳ سال کی عمر ہے، لیکن گفتگو سے محسوس ہوتا ہے کہ ذہن طبعی عمر سے زیادہ پختہ اور بالغ ہے۔ بلوچستان کے مذہبی اور اسلام دوست طلبہ کس انداز میں سوچتے ہیں، ان کے مختصر انٹرویو میں آپ کو کئی باتوں کا جواب ملے گا۔

سوال:۔ آپ کی تنظیم جمعیت طلباء اسلام بلوچستان کے نوجوانوں میں کن مقاصد کی تکمیل کے لیے کام کر رہی تھی؟

جواب: سب سے پہلی بات یہ کہ ہماری تنظیم ملک گیر بنیاد پر ہے۔ یہ چاہتی ہے کہ صحیح عقائد اور اسلامی نظام کا نفاذ ہو، اسلامی اقدار کا تحفظ اور اسلامی نظام تعلیم کا نفاذ ہو، اسی مقصد کی تکمیل کے لیے ہم نے علمائے حق کی سرپرستی کو قبول کیا ہے۔ ہمارا یہ اعلان ہے کہ علمائے حق کی سرپرستی میں ہم کامیاب ہو سکتے ہیں اور ہمارے نوجوان راہ راست پر آ سکتے ہیں۔ بلوچستان میں بھی ہمارا یہی پروگرام ہے۔ ہم ہر اس ازم کے خلاف ہیں جو اسلام کے خلاف ہو گا۔ نظامِ تعلیم اسلامی نہ ہونے کی وجہ سے ہمارے نوجوان غلط راہ پر جا رہے ہیں۔ ہم اسلامی تعلیم حاصل کر کے ہی ایک پر مسرت اور خوشحال زندگی گزار سکتے ہیں۔

سوال:۔ آپ کو اپنے مقاصد میں کس حد تک کامیابی حاصل ہوئی ہے؟

جواب:۔ ہمیں بلوچستان میں سو فیصدی کامیابی ہوئی اور ہمارا یقین ہے کہ یہ پروگرام پورے پاکستان میں کامیاب ہو گا۔ بلوچستان کے عوام اسلام دوست ہیں اس لیے ہمیں ہماری کامیابی کے پورے امکانات ہیں۔

سوال:۔ پختون سٹوڈنٹس فیڈریشن والے کہتے ہیں کہ بلوچستان میں سو فیصدی ہم کامیاب ہوئے ہیں، آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب:۔ بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن اور پختون اسٹوڈنٹس فیڈریشن یقیناً کامیاب ہوئیں، کیونکہ یہ قوم پرست تنظیمیں ہیں لیکن ان کے خیالات محدود ہیں۔ قومیت کا نظریہ عالمی وسعت نہیں رکھتا۔ جبکہ ہمارا نظریہ ملک گیر، بلکہ اسلامی دنیا اور تمام عالم تک پھیلا ہوا ہے۔ کیونکہ ہم اسلام کا آفاقی پروگرام اپنے پاس رکھتے ہیں۔

سوال:۔ آپ نے چند سال قبل بلوچستان میں موجود بعض قوم پرست گروپوں کی کیوں اور کس بناء پر حمایت کی تھی۔

جواب:۔ بھٹو کا دور اس قدر ظالمانہ تھا کہ ہمیں صرف ظالم کو ہٹانے کے لیے ان کے ساتھ اتحاد قائم کرنا پڑا۔ ہم آئندہ بھی طلباء مسائل کے لیے ان کے ساتھ مشترکہ جدوجہد کر سکتے ہیں لیکن ہماری نظریاتی سمتیں جدا جدا ہیں۔ ممکن ہے کہ ایک وقت وہ آئے کہ آپس میں ایک دوسرے کے مقابل ہوں، لیکن ابھی ہمارا اتحاد باقی ہے، ٹوٹا نہیں۔

سوال: بلوچستان میں نوجوانوں کا ایک گروپ کھلم کھلا سیکولر نظام کی حمایت کرتا اور جداگانہ انتخاب کی مخالفت کرتا ہے۔ آپ نے اس کے خلاف کیا لائحہ عمل مرتب کیا۔؟

جواب:۔ سیکولر نظام کی ہم نے مخالفت کی ہے۔ انہوں نے پریس کی حد تک بات کی ہے۔ ہم نے اپنے موقف کا اظہار بھی پریس تک کیا۔ اگر بات جلسے تک پہنچی تو ہم جلسے تک کا جواب دیں گے اور مقابلہ کریں گے، یہ تو ہمارے نظریات کی بات ہے۔ ہمارے عقیدے اور ایمان کے امتحان کی بات ہے، آپ یہ توقع نہ رکھیں کہ ہم اس مسئلے پر چپ رہیں گے لیکن مقابلہ حکمت عملی اور دانشمندی سے ہونا چاہیئے۔

سوال:۔ بلوچستان کے طلباء کے حقیقی مسائل کیا ہیں؟

جواب:۔ بلوچستان کے طلباء کا حقیقی مسئلہ کالجوں کی کمی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ فنی اور ٹیکنیکل اداروں کی کمی بھی ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔

محمد علی خالد

پریس کلب میں "مار دھاڑ"

گذشتہ دنوں کا ذکر ہے مس بے نظیر بھٹو اسندھ کے حالیہ دورے کے دوران حیدرآباد پریس کلب میں مقامی صحافیوں سے ملاقات کے لیے آئیں۔ ان کے ہمراہ پیپلز پارٹی کے رہنماؤں اور کارکنوں کا جم غفیر تھا۔ انہوں نے حیدرآباد بار ایسوسی ایشن سے بھی خطاب کیا جہاں مقامی وکلاء نے یکے بعد دیگرے سوالات کی بوچھاڑ کر کے انہیں پریشان کر دیا۔ سوالات زیادہ تر ان کے والد کے دورِ حکومت اور پیپلز پارٹی کی مختلف پالیسیوں کے متعلق تھے۔ حیدرآباد پریس کلب میں صحافیوں کا ہجوم موجود تھا۔ پیپلز پارٹی کے دورِ اقتدار کے آخری عرصے میں بھٹو بھی حیدرآباد پریس کلب آئے تھے اور انہیں کلب کی تاحیات رکنیت دی گئی تھی۔ اس سے قبل ایوب خان کے دور میں بھٹو نے حیدرآباد پریس کلب میں ہی صحافیوں کو یقین دلایا تھا کہ اگر وہ برسرِ اقتدار آ گئے تو صحافت کو مکمل آزادی دیں گے۔

بے نظیر بھٹو کے صحافیوں سے خطاب کرنے سے قبل حیدرآباد پریس کلب کے سیکرٹری ظہیر احمد نے استقبالیہ تقریر کی۔ انہوں نے کہا کہ پیپلز پارٹی کا عہد صحافت کے قتل کا دور تھا، جب قلم زنجیروں میں جکڑ دیے گئے تھے اور ذہنوں پر ڈیفنس آف پاکستان رولز کے پہرے تھے۔ پیپلز پارٹی کے انتخابی وعدے قصۂ پارینہ بن چکے تھے اور باضمیر صحافیوں کو ظلم و تشدد کی سولیوں پر لٹکا دیا گیا تھا۔ اس کلب میں مسٹر بھٹو نے "آزادیٔ صحافت" کا منشور پیش کیا جسے بعد میں انہوں نے "ٹوائلٹ پیپر" کی طرح استعمال کیا۔ ظہیر احمد نے کہا کہ اس کے باوجود ہم کلب کی روایات کے مطابق آزادیٔ اظہار کے حامی ہیں اور ہر ایک گروہ کے نظریات سے آگہی حاصل کرنا ہمارا پیشہ ورانہ فریضہ ہے۔

جس وقت ظہیر احمد استقبالیہ تقریر کر رہے تھے تو بے نظیر بھٹو اور انکے رفقاء کے چہروں سے پریشانی ظاہر تھی اور وہ بجھی بجھی آنکھوں سے صحافیوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔

بے نظیر بھٹو نے صحافیوں سے خطاب کرتے ہوئے پریس کلب کے سیکرٹری کے الزامات کا جواب دیا۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ قائدِ عوام بھٹو کے دورِ حکومت میں صحافت جتنی آزاد تھی، برصغیر میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ ان کی تقریر زیادہ تر مسٹر ظہیر احمد کی تقریر کا جواب تھی اور اس طرح یہ پریس کانفرنس کلب کے عہدیدار ظہیر احمد اور بے نظیر بھٹو کے مابین مکالمے کی صورت اختیار کر گئی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ بے نظیر بھٹو نے صحافیوں کے سوالات کے جوابات بھی نہیں دیے اور مختصر بات چیت کے بعد کلب سے "کھسکنے" ہی میں مصلحت جانی۔

ذکر ظہور الٰہی کا

کراچی میں قومی اتحاد کے ترجمان اخبار "صداقت" نے قومی اتحاد کے حامیوں سے اپیل کی ہے کہ وہ مسلم لیگ کے رہنما چوہدری ظہور الٰہی کی میٹرک کے امتحان میں کامیابی کے لیے صدقِ دل سے دعا کریں۔ اخبار نے اپنے پہلے صفحے پر باکس میں خبر شائع کرتے ہوئے یہ انکشاف کیا ہے کہ چوہدری ظہور الٰہی اس سال لاہور بورڈ سے میٹرک کا امتحان دے رہے ہیں۔ یہ خبر سندھ کے سیاسی حلقوں میں ابھی تک بحث کا موضوع بنی ہوئی ہے، کیونکہ کراچی سنٹرل جیل میں طویل نظر بندی کے دوران چوہدری ظہور الٰہی کے جو خطوط اور مضامین مختلف رسائل و جرائد میں چھپتے رہے، ان کے سبب ان کی علمی قابلیت کا سکہ عوام پر جم گیا تھا اور عام خیال یہ تھا کہ مستقبل میں حکومتی ذمہ داریوں میں چوہدری ظہور الٰہی سرِ فہرست ہوں گے۔ جب سے انہوں نے ولی خان کی تائید حاصل کی، اس وقت سے بعض حلقوں میں یہ بھی کہا جانے لگا تھا کہ وہ وزیرِ اعظم کی نشست کے امیدوار ہیں، لیکن اب ان کے "نان میٹرک" ہونے کی وجہ سے سندھ میں انکے عقیدت مند سیاسی کارکنوں میں پریشانی کی لہر دوڑ گئی ہے۔ نوجوان مسلم لیگیوں کا خیال ہے کہ مسلم لیگ کی مرکزی کمیٹی کی رکنیت کے لیے کم از کم گریجویشن لازمی قابلیت قرار دی جائے اور غیر تعلیم یافتہ سیاستدانوں پر ملکی سیاست میں حصہ لینے پر بندش عاید کی جائے۔ "روزنامہ مساوات" کے مطابق چوہدری ظہور الٰہی کا لاہور بورڈ کا سیٹ نمبر ۳۰۱۶۵ ہے۔ ہماری دعا ہے کہ یہ سب افواہیں ہوں، ورنہ پاکستان کا آئندہ وزیرِ اعظم نان میٹرک بن گیا تو یہ سارے میٹرک پاس نوجوانوں کی بے عزتی ہوگی جنہیں کلرکی بھی مشکل سے ملتی ہے اور جو بمشکل دفتروں میں چپراسی بن سکتے ہیں۔

سندھ پولیس کا بجٹ کچھ عرصہ پہلے اڑھائی کروڑ تھا، لیکن اب پولیس بجٹ بیس کروڑ روپے ہے۔ البتہ بجٹ میں غیر معمولی اضافے کے باوجود پولیس کی کارکردگی کو تسلی بخش نہیں کہا جا سکتا کہ مارشل لاء حکام بھی چوروں کی "دسترس" سے محفوظ نہیں رہے۔ حیدرآباد میں سرسری سماعت کی فوجی عدالت کے سربراہ میجر مُفتی کے گھر واقع ڈیفنس سوسائٹی میں چوروں نے "ہاتھ صفائی" کی اور پورے گھر کا سامان ساتھ لے گئے۔ ڈیفنس سوسائٹی کنٹونمنٹ ایریا میں ہے اور اس کی پشت پر سپرنٹنڈنٹ پولیس کا بنگلہ ہے۔

سکھر میں میجر کفایت کے گھر سے ہزاروں روپے کا سامان چوری کیا گیا اور حیدرآباد میں ایک کیپٹن کے گھر سے چوری کی اطلاع ملی ہے۔

فقط کراچی میں جنوری اور فروری کے مہینے میں عورتوں کے اغواء کے ۱۴ مقدمات درج ہوئے۔ پولیس کے دعویٰ کے مطابق ۳۰ عورتیں برآمد کر لی گئیں۔ بقیہ ۱۱ عورتیں ہنوز لاپتا ہیں۔

بھٹو کے آبائی شہر لاڑکانہ میں گذشتہ سال ایک ہزار سے زائد قتل، اقدامِ قتل، اغواء اور دیگر سنگین جرائم کے متعلق مقدمات درج کیے گئے۔

حیدرآباد کی ایک بستی عثمان آباد میں ایک دن میں پانچ چوریوں کی واردات ہوئی۔

حیدرآباد میں ایک دلچسپ چوری سیشن کورٹ میں ہوئی، جہاں سے نقب زن ستاون تولے کے زیورات چرا کر لے گئے۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ مارکیٹ پولیس تھانے کے انچارج نور حسین شاہ نے اپنی کارکردگی دکھانے کے لیے حیدرآباد کے کئی صرافوں سے مسروقہ زیورات کے مساوی سونا زبردستی حاصل کر لیا جس پر صرافوں نے احتجاج کیا۔

شہریوں کے ایک حلقے کا مطالبہ ہے کہ سیاستدانوں کے ساتھ ساتھ پولیس اور انتظامیہ کے افسروں کا بھی محاسبہ کیا جائے۔

انور نظامی

دو ہفتے پہلے "صحافت" میں ملتان سے جو ڈائری شائع ہوئی، صاحبزادہ فاروق علی صاحب نے اس کی تردید میں ہمیں خط لکھا تھا اور فرمایا تھا کہ ان کی تو کبھی نمائندہ "صحافت" سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ ہم نے ان کا خط بھی چھاپ دیا تھا۔ اب نمائندہ "صحافت" کی وضاحت پیش خدمت ہے۔ اس موضوع پر مزید بحث کی گنجائش نہیں کہ کسی کیخلاف مہم چلانا "صحافت" کی پالیسی نہیں۔

سچ اور جھوٹ کا فیصلہ خود کر لیجئے

صحافت کے شمارہ نمبر ۱۹ میں صحافت کی نمائندگی کرتے ہوئے ملتان سے میں نے صاحبزادہ فاروق علی کے بارے میں کچھ حقائق پیش کیے تھے۔ صحافت ۲۰ میں صاحبزادہ صاحب نے ان حقائق کو نہ صرف بے بنیاد قرار دیا بلکہ یہ بھی کہا کہ انہوں نے کئی ماہ سے نمائندہ صحافت کو دیکھا تک نہیں۔

گذشتہ ماہ میں نے صاحبزادہ فاروق علی سے ملاقات کی تو میرے ہمراہ صاحبزادہ کے قریبی دوست اور پیپلز پارٹی حلقہ نواں شہر کے صدر شیخ اصغر علی بھی تھے جو مارچ کے انتخابات میں صاحبزادہ صاحب کے پولنگ ایجنٹ بھی تھے۔ میں اپنی ملاقات کی تصدیق میں شیخ اصغر علی صاحب کی تحریری گواہی پیش کر رہا ہوں۔

یہی نہیں بلکہ آجکل صاحبزادہ فاروق علی اپنے والدہ کی علالت کی وجہ سے ملتان میں ہیں اور چند روز پہلے یعنی ۲۳ فروری ۸۷ء کو میں نے پھر صاحبزادہ فاروق علی سے ملاقات کی تو انہوں نے نہ صرف نمائندہ صحافت کو پہچانا بلکہ اس امر کا گلہ بھی کیا کہ آپ کو میرے خلاف نہیں لکھنا چاہیے اور تسلیم کیا کہ اگرچہ ہماری ملاقات ہوئی تھی لیکن چونکہ میں یعنی (فاروق علی)، آج بھی پیپلز پارٹی کے جاگیرداروں اور وڈیروں کے خلاف برسر عمل ہوں، اس لئے آپ کو میری مدد کرنی چاہیے۔

انہوں نے کہا کہ صاحبزادہ فاروق علی ہی پیپلز پارٹی کی صف میں اکیلا مرد قلندر ہے جو غریب ورکروں اور عوام کی بالادستی کے لئے کام کر رہا ہے۔ انہوں نے کہا اگر سابق وزیر اعظم بھٹو مجھ حقیر کا کہنا مان لیتے تو آج پیپلز پارٹی کا یہ حشر نہ ہوتا۔ پیپلز پارٹی کے دور حکومت میں جن جاگیرداروں کا راج تھا آج وہی چھپتے پھر رہے ہیں اور دوسری پارٹیوں میں اپنی جگہ تلاش کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ صرف میں اور شیخ رشید نے ہمیشہ غریب عوام کی نمائندگی کی تھی جسے جاگیردار ٹولہ اچھی نظر سے نہیں دیکھتا تھا اور ملتان کی حد تک ہی نہیں، بلکہ ہر جگہ ان جاگیرداروں نے میری مخالفت کی اور مجھ پر طرح طرح کے بے بنیاد الزام لگائے۔ انہوں نے کہا کہ یہ بات میں اعلانیہ کہتا ہوں کہ میں نے ہزاروں افراد کو مفادات پہنچائے لیکن ایک پائی تک ان لوگوں سے وصول نہیں کی، بلکہ انہی مفاد پرستوں نے مجھے بدنام کیا۔

انہوں نے پیپلز پارٹی کے ایک اور ڈسٹی کونسلر کا نام لیا کہ میں نے اسے ڈیڑھ لاکھ روپے قرض کے کر دیئے لیکن بعد میں اس نے جاگیرداروں کے ساتھ مل کر میری شکست کی راہ ہموار کی لیکن اللہ تعالیٰ انسان کو اس جہان میں بھی سزا دیتا ہے۔ آجکل وہی شخص زیر عتاب ہے اور قانون سے بچنے کے لئے مفرور ہے۔

صاحبزادہ فاروق علی نے انکشاف کیا کہ میں نے سابق وزیر اعظم کو اسی دن کہہ دیا تھا کہ اب ہماری حکومت کا خاتمہ

"گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے"

بخدمت جناب ایڈیٹر ہفت روزہ صحافت لاہور

تسلیم، صاحبزادہ فاروق علی کے بارے میں گذشتہ دنوں کے شمارے میں آپ کے نمائندہ خصوصی انور نظامی کے حوالے سے ڈائری شائع ہوئی، دراصل حقیقت کچھ اس طرح ہے کہ گذشتہ دنوں میں نے خود انور نظامی کے ساتھ صاحبزادہ فاروق علی سے ملاقات کی تھی، انور نظامی کے پوچھنے پر کہ آیا صاحبزادہ فاروق علی کو پیپلز پارٹی کے چیئرمین بھٹو نے ایک کار بطور تحفہ دی تھی تو صاحبزادہ صاحب نے میرے سامنے یہ کہا تھا کہ کار مجھے دی ضرور تھی لیکن میں نے شکریہ کے ساتھ واپس کر دی تھی۔

دوسرا، صاحبزادہ فاروق علی نے انور نظامی سے یہ بھی کہا تھا کہ انہیں سابق وزیر اعلیٰ صادق قریشی نے جان بوجھ کر ہرایا تھا اور انہوں نے سابق وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو کو بذریعہ ٹیلیگرام آگاہ کر دیا تھا اور مطالبہ کیا تھا کہ قریشی گروپ کو پیپلز پارٹی سے نکالا جائے۔

دراصل صاحبزادہ فاروق علی نے ان تمام حقائق کی تردید تو کر دی تھی لیکن صاحبزادہ کی پوزیشن خراب کرنے میں انہی کے کئی دوستوں کا ہاتھ ہے جن میں سرفہرست چودھری شریف، نسیم مسلم اور بعض دوسرے دوست ہیں جو مفاد اٹھانے کے باوجود صاحبزادہ کو بدنام کر رہے ہیں۔ کچھ دنوں پہلے چوہدری شریف جو پیپلز پارٹی کا رکن ہونے کے باوجود پیپلز پارٹی کو بدنام کرنے میں پیش پیش ہے، نے صاحبزادے پر یہ الزام بھی لگایا تھا کہ انہوں نے ملتان کے ایک تاجر کو کئی ٹرکوں کے چیسز کے پرمٹ دیے تھے بہر حال میں ان تمام باتوں کی تردید کرتا ہوں۔ درحقیقت صاحبزادہ صاحب کو اب اپنے دوست اور دشمنوں کی پہچان رکھنی چاہیے۔ میں پیپلز پارٹی حلقہ نواں شہر کا صدر ہوں۔ تحریک نظام مصطفےٰ کے دوران میں میری دکان جلا دی گئی تھی جس کی وجہ سے ہزاروں روپے کا نقصان ہوا اور متعدد مرتبہ مجھ پر قاتلانہ حملے کیے گئے۔ اس کے باوجود پیپلز پارٹی کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اس میں کوئی شک نہیں، صاحبزادہ فاروق علی دیانتدار شخص ہیں ان کے گرد مفاد پرستوں کا ٹولہ جمع ہے جو انہی کی ذات پر کیچڑ اچھال رہا ہے۔ بہر حال صحافت کے نمائندہ مقیم ملتان انور نظامی کا یہ کہنا سو فیصد درست ہے کہ صاحبزادہ فاروق علی سے انہوں نے ملاقات کی تھی اور صاحبزادہ نے مرسیڈیز کار لینے کا بھی اقرار کیا تھا۔

شیخ اصغر علی صدر پیپلز پارٹی نواں شہر۔ ملتان

سمجھو جب پیپلز پارٹی کے صوبائی ارکان نے عوام کی لاشوں پر حلفِ وفاداری اٹھایا تھا۔

انہوں نے مزید انکشاف کرتے ہوئے کہا کہ ۱۹ اپریل کو میں نے اپنے ہمسائے اور قومی اتحاد کے ایک ستارے خان اشرف خان کو اس کے گھر جا کر کہا تھا کہ دوسرے آٹھ ستاروں کو اس بات پر راضی کر لو کہ وہ وزیر اعظم بھٹو کی یہ بات مان لیں اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات دوبارہ کرانے پر رضامندی کا اظہار کر دو، ورنہ حکومت ہماری بھی نہیں رہے گی اور نہ آپ کو ملے گی۔

صاحبزادہ نے بتایا کہ اشرف خان نے میری اس بات کا مثبت جواب نہ دیا۔

صاحبزادہ نے کہا کہ اب میں پیپلز پارٹی میں رہ کر ایک فرض پورا کر رہا ہوں، اگر چھوڑ جاؤں تو میرا کچھ نہیں بگڑے گا، لیکن بُرے وقتوں میں پیپلز پارٹی کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا، البتہ اگر مفاد پرست جاگیرداروں کے ٹولے کا صفایا نہ ہوا تو میں پارٹی ضرور چھوڑ دوں گا۔

قارئینِ صحافت کی اطلاع کے لئے میں یہ تمام حالات لکھ رہا ہوں، واضح رہے کہ پہلی ملاقات میں شیخ اصغر علی صدر حلقہ نواں شہر ملتان میرے ساتھ تھے جنکی تصدیق وہ اس ڈائری کے ساتھ بھجوا رہے ہیں۔ دوسری ملاقات ڈائری کے چھپنے کے بعد ہوئی اور اس میں صاحبزادہ صاحب نے گلہ کیا کہ آپ کو ایسا نہیں لکھنا چاہیے تھا کیونکہ وہ ہماری آپس کی بات تھی، پریس کے لئے نہیں تھی۔ عجیب بات ہے کہ آج صاحبزادہ صاحب نہ صرف دونوں ملاقاتوں سے منکر ہیں بلکہ یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے گذشتہ کئی ماہ سے نمائندہ صحافت کی شکل تک نہیں دیکھی۔ اس سلسلے میں ان کا دلدوز و دلسوز قسم کا خط صحافت میں چھپا ہے جسے پڑھ کر مجھے خود اپنے آپ پر شبہ ہونے لگا ہے کہ میں نیند میں ہوں یا جاگ رہا ہوں۔

صاحبزادہ صاحب سابق سپیکر قومی اسمبلی ہیں، پیپلز پارٹی کے نائب صدر ہیں، بڑے آدمی ہیں اور نمائندہ صحافت ایک غریب مزدور اور کارکن، اس لئے وہ شاید ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔ اس لئے کہ زر پرستی کے اس معاشرے میں سچا وہی ہے جس کے پاس بنک بیلنس زیادہ ہو۔

ادارے کو اطلاع ملی ہے کہ ملتان اور مضافات میں "صحافت" کی ترسیل درست نہیں ہو رہی۔ آپ کو کیا مشکلات ہیں ہمارے نمائندہ انور نظامی صاحب کو مطلع کیجئے یا براہِ راست ہمیں لکھیئے۔

شیخ محمد معقوب

عوام کے موجودہ مسائل کیا ہیں؟

میں ان کے حل کا

فارمولا پیش کرتا ہوں

پاکستانی عوام کا سب سے بڑا مسئلہ نظم و نسق کی ابتری اور انتظامیہ کا نامناسب طرزِ عمل اور اپنے فرائض سے کوتاہی ہے، اس سلسلے میں چونکہ سب سے زیادہ واسطہ پولیس سے پڑتا ہے لہٰذا عام طور پر اس محکمہ کے بارے میں اس قدر شکایات ہیں کہ بعض لوگ حل کر یہ تجویز کرتے ہیں کہ سرے سے یہ محکمہ ہی توڑ دیا جائے، لیکن یہ حل قابلِ عمل نہیں۔ کیونکہ پولیس کے بغیر بہر حال کام نہیں چل سکتا، لہٰذا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایسا طریقِ کار تلاش کیا جائے جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

مثال کے طور پر حسب ذیل تجاویز ملاحظہ ہوں:

۱۔ امنِ عامہ کی بحالی کے لیے پولیس سے کسی بھی شخص کو گرفتار کرنے کے اختیارات ختم کر دیے جائیں۔

۳۔ اگر کسی جگہ لڑائی جھگڑا ہو جائے تو پولیس فوری مداخلت کر کے فریقین کو الگ کرا دے۔

۴۔ کسی با اختیار عدالت یا ادارہ کی طرف سے جاری کردہ سمن یا وارنٹ کی تعمیل پولیس کے ذمے ہو۔

۵۔ سرکاری عمارتوں اور املاک کی حفاظت کرے۔

۶۔ با اختیار اداروں، عدلیہ اور انتظامی محکموں کے تفویض کردہ فرائض کی تکمیل کرے۔

انتظامی امور، عوام کے سپرد ہوں

عوام کے منتخب نمائندوں پر مشتمل یونین کمیٹی اور یونین کونسلوں کو امنِ عامہ کی تمام تر ذمہ داری سونپ دی جائے۔

ہر کمیٹی اور کونسل میں پندرہ سے بیس ارکان کی مجلسِ مشاورت بنائی جائے۔

مجلسِ مشاورت کا ہر رکن اپنے علاقہ میں با اختیار ہو۔

۱۔ یہی رکن متنازعہ امور کا تصفیہ کرائے۔

۲۔ جو مقدمات باقاعدہ عدالت کی سماعت کے لائق ہوں انہیں عدالت کے سپرد کرنے کی سفارش کرے۔

۳۔ اپنے علاقہ میں نظم و نسق کا ذمہ دار ہو۔

۴۔ عوام کی ضروریات، صحت و صفائی کے مسائل حل کرے اور متعلقہ محکموں کی کارروائی پر عوامی نمائندے کے اعتبار سے نظر رکھے۔

۵۔ عادی مجرموں کی فہرست مرتب کر کے انہیں اصلاح کی ترغیب دے اور عوام کو ان پہ کڑی نظر رکھنے کی نصیحت بھی کرے۔

جو لوگ اصلاح قبول کر لیں، انہیں آزادی سے زندگی گزارنے کا موقع دیا جائے، بلکہ ان کے لیے رزقِ حلال کمانے کے مواقع بہم پہنچانا کونسلوں کا فرض ہو۔

اور جو لوگ اصلاح قبول نہ کریں انہیں تربیت گاہوں میں بھیج دیا جائے اور اس وقت تک نہ چھوڑا جائے جب تک توبہ نہ کر لیں۔

(۶) عوام کی ذہنی تربیت کا اہتمام کرے اور دینی ضروریات کو ملحوظ رکھے۔

(۷) گروہی یا قومی تعصبات کو پھیلنے سے روکے۔

(۸) انسانی حقوق کے احترام کے لیے ترغیب دے۔

(۹) مساوات اور انصاف پر مبنی معاشرہ قائم کرنے کے لیے تجاویز دے اور متعلقہ محکموں کو تنبیہ کرے۔

(۱۰) عام انتخابات میں اسمبلیوں کے نمائندے منتخب کرنے کے لیے ووٹ کے صحیح استعمال اور آزادیٔ رائے کو برقرار رکھے۔

(۱۱) جو نوجوان بے کار ہوں انہیں تلاشِ معاش میں مدد دے۔

ان تجاویز سے حکومت کے اختیارات دار الحکومتوں میں مرتکز ہونے کے بجائے عوام تک پہنچیں گے اور عوام میں اپنے مسائل خود حل کرنے کا تصور پیدا ہوگا جو جمہوری عمل کی روح ہے۔

اس سلسلے میں موجودہ مجسٹریٹ اپنے اپنے علاقوں کے نگران بنا دیے جائیں اور ڈپٹی کمشنر ضلع کا نگران ہو۔ عدلیہ کو انتظامیہ سے الگ کرنا بھی حصولِ انصاف کیلئے ضروری ہے کیونکہ موجودہ شکل میں وہی افسر ضلع ہے اور وہی عدالت۔

تعلیم کا مسئلہ

میٹرک تک تعلیم لازم اور مفت ہو۔ تاریخ، شہریت، جغرافیہ، سائنس اور تین زبانیں عربی، اردو، انگریزی، لازمی مضامین کی حیثیت سے پڑھنے والا ہر نوجوان بنیادی معلومات ضرور حاصل کرے گا۔

جو طالب علم فرسٹ یا سیکنڈ ڈویژن حاصل کریں، صرف انہیں اعلیٰ تعلیم کی اجازت دی جائے اور دولت کے بل پر امرا اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم نہ دلائیں اور غربا کے بچے تعلیم سے محروم نہ رہ جائیں بلکہ غریب کا بیٹا لائق ہے تو وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکے اور اس کے تمام تر اخراجات متعلقہ حکومتی ادارے اور کونسلیں مل کر ادا کریں۔

اس طرح ہر علاقہ اور کونسل اپنے اپنے مختص طلبہ کی افزائش کی ذمہ دار ہوگی۔

غیر محنتی طلبہ جو اچھے نمبر نہ لے سکیں، میٹرک کے بعد ان کی رضامندی اور شوق کے مطابق زندگی کے دوسرے شعبوں میں کام پر لگایا جائے۔

کسی شخص کو بے کار زندگی گزارنے کی اجازت نہ دی جائے۔

تعلیم کے بعد ہر شخص کو روزگار مہیا کرنا حکومت کی ذمہ داری ہو۔ بے کاری جرم اور معیوب قرار دی جائے۔

زمین اور زراعت کے مسائل

ہر کاشتکار جس کے پاس ۱/۲ ۱۲ ایکڑ سے کم زمین ہے اُسے اور زمین دی جائے۔ انتقالِ اراضی اسی بنیاد پر کی جائے۔

زمین کا مالک دراصل اللہ ہے، حکومت انتظامی اصلاح کے لیے کسی شخص سے بھی زمین واپس لے سکتی ہے، مگر اس کا معاوضہ مناسب دیا جائے اور جس کاشتکار کو یہ زمین دی جائے، قسط وار اس سے رقم دلائی جائے۔

اس طرح ہر شخص کو جو اپنے ہاتھ سے کاشت کرتا ہے اور اس کے پاس ایک جوڑا بیل اور ہل ہے، شادی شدہ ہے، فرد پٹوار میں اس کا نام بحیثیت کاشتکار درج ہے، ۱/۲ ۱۲ ایکڑ اراضی دیکر خود کفیل معاشرہ پیدا کیا جائے۔

یہ زمین ناقابلِ تقسیم قطعہ ہوگی۔ جو لوگ بھی اس کے وارث ہوں گے وہ حقِ انتفاع کا معاوضہ تو وصول کر سکیں گے، مگر اس زمین کو تقسیم نہیں کر سکیں گے تاکہ ۱/۲ ۱۲ ایکڑ اراضی سے کم ٹکڑے نہ ہو سکیں۔ مشینی کاشت کاری کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

ایسے فارم بنائے جائیں جن سے کاشت کار زرعی آلات کرایہ پر حاصل کر سکیں۔ نیز زرعی آلات، کھاد وغیرہ پر حکومتی منافع کو ختم کیا جائے اور یہ چیزیں براہِ راست قیمت پر دی جائیں۔

جابجا زرعی ورکشاپ بنائے جائیں تاکہ ٹریکٹروں اور ٹرکوں کی مرمت قریب ترین جگہ سے ہو سکے۔ ہر یونین کونسل میں کم از کم ایک ورکشاپ اور ایک فارم ضرور ہو۔

مزدوروں اور محنت کشوں کے مسائل

مزدوروں کے لیے وہ تمام سہولتیں جو اس وقت میسّر ہیں، برقرار رکھی جائیں، بلکہ مزید بہتر سہولتیں دی جائیں، البتہ معاوضہ کے ساتھ ساتھ کام کی شرح بھی مقرر کی جائے تاکہ آجر کو اچھا معاوضہ دے کر اچھا کام مل سکے۔

انقلابی تبدیلی یہ کی جائے کہ سالانہ آمدنی کا نصف حصہ مزدوروں کی ملکیت قرار دیا جائے اور ہر مزدور کے کھاتے میں یہ رقم کسی بنک میں جمع کر دی جائے۔ جب مزدور ریٹائر ہو جائے تو اسے یہ رقم یکمشت دی جائے یا پنشن کے طور پر ہر ماہ اس کی ضرورت کے مطابق ادائیگی کی جائے۔ مزدور اس رقم میں سے قرض بھی لے سکیں۔

اس طرح مزدور تحفظ بھی محسوس کرے گا اور املاک کو بھی نقصان نہیں پہنچائے گا بلکہ حفاظت کریگا، اور پیداوار بھی بڑھے گی، کیونکہ جب منافع میں سے اسے نصف ملنے کی توقع ہوگی تو وہ ہر قیمت پر منافع کما کر دے گا۔

دفاع اور امورِ خارجہ

ملک کی دفاعی قوت کو زیادہ سے زیادہ بڑھایا جائے۔ اس مقصد کے لیے نوجوانوں کو فوجی تربیت دینا لازم ہے تاکہ وہ جنگ کے دوران میں فوج کا ہاتھ بٹا سکیں۔ جہاں تک خارجہ پالیسی کا تعلق ہے اس میں کسی بڑی تبدیلی کی ضرورت نہیں البتہ غیر ممالک میں جو سفارتخانے ہیں ان کی اصلاح کی بہت ضرورت ہے۔ جو سفیر سفارت کے ساتھ ساتھ تجارت بھی کرتے ہیں انہیں واپس بلایا جائے۔ جو عیش و عشرت کو سفارت خیال کرتے ہیں ان کو بھی یک قلم ہٹا دیا جائے۔ سفارش یا رشوت کے طور پر سفیر مقرر کرنے کی روایت ختم کی جائے۔ ایسے لوگ سفیر بنائے جائیں جو ملی اور قومی جذبات کو ملحوظ رکھیں۔ اساتذہ، علماء اور دانشوروں کو ترجیح دی جائے۔

خصوصاً مسلمان اور عرب ممالک میں ایسے سفیر بنائے جائیں جو عربی یا اس ملک کی مقامی زبان اچھی طرح جانتے ہوں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نماز روزہ کے پابند ہوں اور مذہبی طرزِ زندگی بسر کرتے ہوں، مقصد یہ ہے کہ ایک اسلامی ریاست کی نمائندگی کرتے وقت اس کی اقدار اور سوچ کی بھی نمائندگی کریں۔

جو لوگ بیرونِ ملک محنت کرکے زرِ مبادلہ مہیا کرتے ہیں انہیں مزید سہولتیں دی جائیں، ان پر کسٹم وغیرہ کی پابندیاں نرم کی جائیں، عملہ ایماندار مقرر کیا جائے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ باعزت روزگار مہیا کرنے میں لوگوں کی رہنمائی اور امداد بہتر طور پر کی جائے تاکہ اندرونِ ملک وسائلِ روزگار میسر آ سکیں۔

حبیب الوہاب الخیری

○—— اسلامی قوانین کا مسئلہ کہاں اٹک گیا ہے؟

○—— وہ کون لوگ ہیں جو اسلامی آئین کے راستے میں رکاوٹ ہیں

بیچارے جسٹس چیمہ کس مشکل میں ہیں؟

یکم جنوری ۱۹۷۸ء کو قوم نے جنرل ضیاء الحق کی زبان سے یہ تاریخی اعلان سنا کہ ملک کی اعلیٰ عدالتوں کو آج سے یہ اختیار حاصل ہوگا کہ وہ غیر اسلامی قوانین کو باطل قرار دے سکیں۔ یہ ایسا اعلان تھا جس سے آزادی کے باوجود یہود و نصاریٰ کی غلامی میں جکڑے ہوئے مسلمانوں کو نویدِ سحر ملی۔ مجھے ـــــ اور میری طرح کے کروڑوں محبانِ وطن اور جاں نثارانِ اسلام کو محسوس ہوا کہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو نہیں، بلکہ حقیقی معنوں میں آج آزادی ملی ہے اور اب اللہ کے عطا کردہ اس وطن میں کوئی اللہ کی حکم عدولی پر مجبور نہیں ہوگا اور آج سے حقیقی اسلامی معاشرے کا ارتقا شروع ہو جائے گا۔

یہ اعلان اسلام کا سچا سپاہی ہونے کے دعویدار نے کیا تھا، لیکن جب عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا تو آواز آئی کہ ہم ان ہی غیر اسلامی قوانین کے پابند ہیں۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء الحق کا یہ اعلان محض اعلان ہی ہے۔ اسے قانون کا درجہ حاصل نہیں۔ معلوم ہوا کہ جنرل ضیاء الحق نے اپنے تاریخی اعلان کو قانون کا درجہ دینے کے لیے اسلامی نظریاتی کونسل اور وزارتِ قانون سے آئین میں ترمیم کا مسودہ طلب کیا ہے، جن سے یہ مسودہ آج تک تیار نہیں ہو پایا۔

چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے قانونی مشیر جناب ے کے بروہی اور اسلامی مشاورتی کونسل کے چیئرمین عدالتِ عظمیٰ کے ریٹائرڈ جج جناب جسٹس محمد افضل چیمہ نے یہ استدلال شروع کرایا کہ صدیوں سے نافذ نظام کو رفتہ رفتہ ہی بدلا جائے گا۔ یہ استدلال امید کے بعد مایوسی کو جنم دے رہا تھا اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ یہود و نصاریٰ کی پہنائی ہوئی زنجیروں سے نجات نہ مل سکے گی۔ میں نے اِدھر اُدھر سے ٹوہ لگانے کی کوشش کی، لیکن مایوسی کے بادل چھٹتے نظر نہ آئے، تو سوچا چیمہ صاحب سے ہی دریافت کیا جائے کہ آخر کیا مشکل درپیش ہے اور اتنے فضلاء اور حکماء کہاں پھنس کر رہ گئے ہیں۔

چنانچہ ایک دن میں ان کے دفتر پہنچا۔ انہوں نے مصروفیت کے باوجود عنایت فرمائی اور گفتگو کے لیے وقت نکالا، فرمایا کہ بعض لوگ کہہ رہے ہیں کہ کس بے وقوف نے جنرل ضیاء الحق سے پہلے یہ اعلان کروایا ہے، حالانکہ قطعی واضح تھا کہ اس اعلان کا مشورہ خود انہوں نے دیا تھا۔ میں نے مبارکباد پیش کی کہ یہ تمغہ مبارک ہو کہ آغاز میں اس کا ملنا ضروری تھا۔ ہمارے آقائے نامدار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دعوتِ دین کا آغاز فرمایا تو انہیں بھی مخالفین کی جانب سے "مجنون" کا خطاب دیا گیا تھا۔

جناب چیمہ کی زبانی جو مسائل سنے تو معلوم ہوا کہ یہود و نصاریٰ جو استدلال صدیوں سے دے رہے ہیں، وہی مغربی تہذیب کے غلاموں نے پیش کر رکھے ہیں۔

ان کا کہنا ہے کہ سود ساری دنیا میں رائج ہے۔ اس سے نجات مشکل ہے۔ ہماری معیشت کی بنیاد سود ہے، اسے ختم کیا گیا تو چلتی ہوئی گاڑی جام ہو جائے گی۔ سود کے خلاف اللہ تعالیٰ نے حکم دے رکھا ہے، اس لیے عدالتوں کو غیر اسلامی قوانین کالعدم قرار دینے کا اختیار ملا تو سب سے پہلا مسئلہ سود ہی کا ہوگا وغیرہ وغیرہ۔

میں نے عرض کیا، اگر اس استدلال کو تسلیم کیا جائے تو پھر پاکستان کے وجود سے بھی ہاتھ دھونا پڑیں گے، کیونکہ دنیا میں ایسا کوئی ملک نہیں، جو اسلامی نظریات کی بنیاد پر وجود میں آیا ہے۔ اگر اسلام کہیں نافذ نہیں تو یہاں کیسے ہو سکتا ہے اور اگر یہ درست ہے تو یہ وطنِ عزیز کیسے قائم رہ سکتا ہے۔ مزید عرض کیا، حضور دوسری تہذیبوں کے غلام کوئی راستہ نہیں دکھا سکتے، انہیں اپنی عقل و شعور کے آگے کچھ نہیں دکھائی دیتا۔ وہ تو سرے سے اس عقیدے کے ہی قائل نہیں ہوتے کہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ اصول و ضوابط خامیوں سے پاک ہوتے ہیں اور انسان کے بنائے ہوئے قوانین ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اللہ انسانوں پر اپنی نعمتوں کی بارش کرنا چاہتا ہے لیکن وہ کوتاہ بین سوچتا ہے کہ اس میں اس کا نقصان ہوگا۔ اس کی سمجھ سے یہ بالاتر ہے کہ اگر سود انسان کے لیے مفید ہوتا تو اللہ تعالیٰ اسے ممنوع قرار نہ دیتا۔ اس کے خاتمے سے اگر قومیں تباہی میں مبتلا ہونے والی ہوتیں تو وہ مسلمانوں پر کبھی اسے حرام قرار نہ دیتا۔

بات صرف اتنی ہے کہ مشورہ دینے والے اللہ کی اطاعت کے صحیح جذبے سے سرشار نہیں۔ ہو سکتا ہے، جناب چیمہ کو میری گذارشات شاق گذری ہوں اور انہوں نے بھی سوچا ہو کہ کس بے وقوف سے پالا پڑا ہے کہ وہ مسائل کو سمجھنے کے لئے تیار نہیں اور سود کے خاتمے کو نعمتِ خداوندی قرار دے رہا ہے۔ بالآخر انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ پھر میں ہی کوئی قابلِ عمل دستوری ترامیم کا مسودہ بنا کر لے آؤں۔

میں نے ایک مسودہ ترامیم دستور ۱۹ فروری کو اسلامی نظریات کی کونسل کو پیش کر دیا۔ میرا دعویٰ ہے کہ اسے نافذ کرنے سے آسمان ہمارے سر پر نہیں آن گرے گا بلکہ خدا کی رحمتوں کا ایک باب کھل جائے گا، سرمایہ پرستی ختم ہوگی، حکومت کے وسائل میں بے پناہ اضافہ ہوگا، جنہیں عوام کی فلاح و بہبود پر صرف کیا جا سکے گا۔ بڑے بڑے سرمایہ داروں کی تجوریوں سے سرمایہ نکل کر عوام میں گردش کرنے لگے گا اور دیکھتے دیکھتے عوام کی حالت بدل جائے گی۔ غربت و افلاس کا خاتمہ ہوگا اور ملک میں زکوٰۃ لینے والا کوئی نہ ملے گا۔ میری گذارش ہے کہ اسے فوری طور پر نافذ کر کے جنرل ضیاء الحق قوم سے کیا ہوا وعدہ بھی پورا کریں اور اللہ تعالیٰ کے ہاں سرخرو بھی ہوں۔ اس ناچیز کا پیش کردہ مسودۂ دستور یہ ہے:

مسودۂ ترمیم دستور:

(۱) آئین کے آرٹیکل دو کی جگہ جس میں صرف یہ لکھا ہے کہ پاکستان کا سرکاری مذہب اسلام ہوگا، مندرجہ ذیل عبارت لکھی جائے:

"پاکستان کا سرکاری دین اسلام ہوگا اور قرآن پاک و سنت ملک کا بنیادی قانون ہوگا۔ تمام قوانین، رسم و رواج اور ہر وہ چیز جسے قانون کا درجہ حاصل ہو، ملک کے بنیادی قانون کے مطابق ہوگی اور آرٹیکل ۲۲۷ کے مندرجات کی بنیاد پر وہ اس حد تک باطل ہوں گے جس حد تک وہ اس بنیادی قانون سے متصادم ہوں گے۔

ماسوائے اس کے کہ غیر مسلموں کو اپنے مذہب کے مطابق زندگی گذارنے کی آزادی ہوگی تاہم وہ مسلمانوں کے نظریات کے احترام اور ہر شہری دوسرے شہری کے عقائد کی تکریم کا پابند ہوگا۔

(۲) آرٹیکل ۵ کی ضمن ۲ میں مجوزہ ترمیم کے بعد اس کی شکل مندرجہ ذیل ہو جائے گی:

"قرآن و سنت، آئین اور قانون کی اطاعت ہر شہری پر جہاں کہیں بھی وہ ہو اور ہر اس شخص پر جو پاکستان میں ہو، واجب ہوگی۔

(۳) آرٹیکل ۶ میں ترمیم کے بعد اس کی صورت یہ ہو جائے گی:

"ہر وہ شخص جو قرآن و سنت اور دستور کو ختم کرنے کی کوشش کرے گا یا اس کے خلاف سازش کریگا اسے توڑے گا، اس کی کوشش کرے گا یا توڑنے کی سازش کرے گا، خواہ وہ بذریعہ قوت ہو یا قوت کے اظہار کے ذریعے ہو، اسے غداری کا مرتکب قرار دیا جائے گا۔"

(۴) آرٹیکل ۲۱ میں مجوزہ ترمیم کے بعد اس کی شکل یہ ہو جائے گی:

"کسی شخص کو ایسا خصوصی ٹیکس ادا کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا، جس کی رقم اس کے مذہب کے علاوہ کسی دوسرے مذہب کی تشہیر و تبلیغ پر صرف کرنا مقصود ہوگا اور نہ اسے کسی ایسی رقم کی ادائیگی پر مجبور کیا جائے گا جس کی وصولی اسلام میں ممنوع ہو۔"

(۵) آرٹیکل ۲۴ میں حصول املاک کے لیے معقول معاوضہ کی ادائیگی کو لازمی قرار دیا جائے گا۔ جبکہ موجودہ دستور میں بغیر معاوضہ یا برائے نام معاوضہ کی بنیاد پر ہر جائیداد جبراً حاصل کی جاسکتی ہے اور معاوضہ کی شرح کو کسی عدالت میں چیلنج بھی نہیں کیا جاسکتا۔ واضح رہے، اس وقت مکانات کے لئے حصولِ اراضی کے قانون مصادرہ ۱۹۷۳ء کے تحت ہر جائیداد صرف ڈھائی ہزار روپیہ کنال پر جبراً حاصل کی جاسکتی ہے اور اس رقم کو کسی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔

(۶) آرٹیکل ۱۷۵ میں ترمیم کرکے اسے مندرجہ ذیل صورت دی گئی ہے:

"کسی عدالت کو قرآن و سنت، آئین اور قانون کے عطا کردہ اختیارات کے سوا سماعت کا کوئی اختیار نہیں ہوگا۔"

(۷) آرٹیکل ۲۲۷ ضمن نمبر ۲ حذف کر دی جائیگی، جس کے تحت اسے نہایت ہوشیاری اور مکاری کے ساتھ بے اثر بنایا گیا تھا۔ اب اس آرٹیکل کی صورت مندرجہ ذیل تجویز کی گئی ہے۔

"۲۲۷ (۱) تمام نافذ الوقت قوانین کو قرآن و سنت میں فراہم کردہ اسلامی احکامات کے مطابق بنایا جائیگا۔ اس حصہ میں ان کے لئے اسلامی احکامات کی اصطلاح استعمال کی جائے گی اور کوئی قانون اسلام کے منافی نہیں بنایا جائے گا۔"

(۲) عدالتِ عظمیٰ اور عدالت ہائے عالیہ کو کسی بھی مجروح مسلم شہری کی درخواست پر کسی بھی قانون کو اس حد تک باطل قرار دینے کا اختیار ہوگا جس حد تک وہ قرآن و سنت کے منافی و متصادم ہوگا۔

شرط یہ ہوگی کہ رقم کے معاملے میں درخواست گذار یہ دعویٰ کر سکنے کے لائق ہو کہ وہ نہ تو کسی سے ایسی رقم خود وصول کر رہا ہے اور نہ کسی کو ادا کر رہا ہے۔

مزید شرط یہ ہوگی کہ عدالت اس قسم کی درخواست پر متعلقہ حکومت یا ادارے کو اپنے معاملات اسلام کے مطابق درست کرنے کے لیے معقول مہلت دے سکے گی، جن کے بارے میں مجوزہ اعلان کے سبب تہہ و بالا ہونے کا خدشہ لاحق ہو۔

مزید شرط یہ ہوگی کہ کسی بنک، صوبائی یا وفاقی محکمہ کی جانب سے دیئے جانے والے تمام قرضے جو کسی تجارت کے لیے دیئے گئے ہیں، ادائیگی کی تاریخ سے متعلقہ تجارت یا صنعت میں حصص شمار کئے جائیں گے، ان کے نفع نقصان میں قرضہ دینے والے برابر کے شریک ہوں گے، انہیں یہ بھی اختیار ہوگا کہ معقول نوٹس کی بنیاد پر وہ اس کاروبار سے اپنا سرمایہ مع منافع واپس لے لیں۔

۸۔ آرٹیکل ۲۳۲ میں ترمیم کے ذریعہ اسے وہی شکل دینا مقصود ہے جو اس دستور کی منظوری کے وقت اور بھٹو کی جابرانہ ترامیم سے قبل تھی یعنی ہنگامی حالات کے نفاذ کو ہر چھ ماہ بعد اسمبلی کے سامنے منظوری کے لیے پیش کرنا ضروری ہوگا۔

۹۔ آرٹیکل ۲۳۲ میں سے ضمن نمبر ۲ حذف کی گئی ہے جس کے تحت صدر کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ ہنگامی حالات کے دوران جس بنیادی حق کو چاہیں معطل کر سکتے ہیں مجوزہ ترامیم کے ذریعہ بنیادی حقوق کو ہنگامی حالات کے دوران بھی معطل نہیں کیا جاسکے گا، کیونکہ اسلام کی رو سے ہر شخص کا بنیادی حق ہیں۔

۱۰۔ آرٹیکل ۲۳۸ میں ترمیم کے ذریعہ تجویز کیا گیا ہے کہ آئین میں کوئی ایسی ترمیم نہیں کی جاسکے گی جس کا مقصد قرآن و سنت کو بے اثر کرنا، عدلیہ کے اختیارات محدود کرنا اور آئین کے بنیادی ڈھانچہ کو بدلنا ہوگا۔ ہر ترمیم صرف آئین کو بہتر بنانے کے لیے کی جاسکے گی۔ اس کے ذریعے کسی ایسے حق کو بھی ختم نہیں کیا جاسکے گا، جسے قرآن و سنت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے یا آئین نے پہلے سے عطا کر رکھے ہوں۔ شہریوں کے حقوق میں اضافہ ہو سکتا ہے، کمی نہیں ہو سکتی۔

۱۱۔ آئین کے آرٹیکل ۲۶۰ کی ضمن نمبر ۲ میں رائج الوقت قوانین کی تعریف میں قرآن و سنت کو بھی شامل کیا جانا مقصود ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اس مسودہ کی منظوری اور نفاذ سے اسلامی معاشرے کا ارتقا شروع ہو جائے گا۔ اس سے ایسے سرمایہ داروں کو تکلیف ہوگی جو قوم کی دولت پر کروڑ پتی اور ارب پتی بن گئے ہیں، کیونکہ انہیں اب حاصل کردہ قرضوں پر ۱۳ فی صد سود کی بجائے دو سو فیصد یا جتنا بھی وہ کما رہے ہیں، منافع حکومت ادا کرنا ہوگا، اس سے کسی غریب کو تکلیف نہیں ہوگی بلکہ ضرورت مندوں کو سود کی لعنت سے نجات مل جائے گی جن کا بال بال سود میں بندھا ہوا ہے، میں اس پر ہر قسم کے اعتراضات کی دعوت دیتا ہوں، جن کے جواب ان ترامیم کے ذریعہ دینے کی کوشش کروں گا، تاہم حکومت سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنے اعلان کو بلا تاخیر عملی جامہ پہنائے۔ جہاں تک غیر ملکی قرضوں کا تعلق ہے حکومت کو چاہیے کہ مسلم ممالک سے مدد کی اپیل کرے۔ معلومات کے مطابق ایک بار شاہ فیصل نے وعدہ کیا کہ اسلامی نظام نافذ کیا جائے تو وہ پاکستان کے تمام قرضے ادا کرنے کے لیے تیار ہوں گے، آئندہ کسی سے سود کی بنیاد پر قرض نہ لیا جائے اور اپنی روکھی سوکھی پر گزارا اور قناعت کرکے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی کوشش کی جائے۔ بازاروں میں غیر ملکی سامان اور ہماری ذاتی زندگیوں میں تعیشات نہ ہوں گے تو بھی زندگی گزاری جاسکتی ہے اور اس ملک میں پچانوے فیصد لوگ گزارتے ہیں، صرف پانچ فیصد لوگوں کے آرام و آسائش کے لیے ساری قوم کو رہن رکھنا کہاں کا انصاف ہے، اگر چین برسوں تک غیر ملکی سامان کے بے غیرت گزر کر سکتا ہے اور اپنے وسائل کو بروئے کار لا کر درمیان پر کھڑا ہو سکتا ہے تو ہم کیوں نہیں ہو سکتے۔ ضرورت نیک نیتی اور ایمانداری کی ہے۔

اس نے اندرا گاندھی پر شرمناک الزامات لگائے، یہ باب پبلشر نے نکال دیا

چند ہفتے قبل پنڈت نہرو کے پرائیویٹ سیکرٹری مسٹر متھائی کی ایک کتاب کی تلخیص معاصر اسلامی جمہوریہ میں شائع ہوئی تھی، جس میں پنڈت جی کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی ذات پر بھی خاصا کیچڑ اچھالا گیا ہے اور انہیں شرابی قرار دیا گیا ہے۔

ذیل میں ہم ہفت روزہ "نئی دنیا" دہلی کی ۲۰ فروری ۸۰ کی اشاعت کے صفِ اول سے ایک مضمون نقل کر رہے ہیں، جس میں معاصر مذکور نے متھائی اور اس کی کتاب پر تنقید کی ہے۔

متھائی کی طرف سے نہرو کا اصل داماد ہونے کا دعویٰ

مشہور جرنلسٹ خشونت سنگھ نے آج تک بہت سے تجزیے کئے ہیں۔ ان میں جہاں بہت سے تجزیے غلط ثابت ہوئے ہیں، وہیں ان کے تجزیے بڑے نپے تلے اور صحیح بھی ہوئے ہیں۔ مثلاً حال ہی میں انہوں نے متھائی کو نمک حرام لکھا ہے۔ یہ تجزیہ صحیح ضرور ہے مگر اس میں ذرا سی کمی رہ گئی ہے۔ ہماری نظر میں متھائی نہ صرف نمک حرام ہے بلکہ تیرہ سالہ چیتی حرام کھانا حرام، پینا حرام، اٹھنا بیٹھنا حرام، لیٹنا سونا حرام اور اس سے متعلق جتنی حرام قسمیں ہو سکتی ہیں، سب کچھ ہے۔

متھائی کا کہنا ہے کہ اس نے اپنی وفاداری کا جو ثبوت کتاب کی شکل میں نہرو فیملی سے متعلق ہندوستانی عوام کو دیا ہے، اس کی وجہ پیسہ نہیں ہے۔ وہ پہلے ہی کافی مالدار ہے اور نہرو کے ہاں آنے سے پہلے ہی اس کے پاس کافی پیسہ تھا۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ یہ پیسہ کہاں سے آیا تھا تو علاوہ آئیں غائیں کرنے کے اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ درحقیقت نہرو کے ہاں آنے سے پہلے اس کی حالت ایک عام ہندوستانی فقیر سے زیادہ اچھی نہ تھی اور اس کی نہرو کے ہاں سے چھٹی بھی اسی لیے ہوئی تھی کہ اس کے خلاف نہرو کو ہیرا پھیری کی متعدد شکایتیں موصول ہوئی تھیں اور ان سب باتوں کو چھوڑیئے اگر یہ کتاب اس نے پیسہ کمانے کے لیے نہیں لکھی تو کیا اس نے اس کتاب کی آمدنی غریبوں میں دان کر دی ہے؟

انگریزی ہفت روزہ "سنڈے" کو اس نے ایک انٹرویو دیا ہے۔ بڑا دلچسپ ہے۔ کچھ نمک حرام، نمک حرامی کر کے منہ چھپا لیتے ہیں مگر متھائی......! شاید پرلے درجے کا بے غیرت بھی ہے۔ وہ مسکراتا ہے، ہنستا ہے اور قہقہوں کے درمیان بہت سے سوالوں کا جواب دیتا ہے۔

متھائی کی کتاب میں ایک باب "SHE" یعنی وہ عورت کے نام سے ہے جس کو پبلشر نے یہ کہہ کر نکال دیا کہ یہ فحش انداز میں لکھا تھا، جو یقیناً پوری کتاب ضبط کروا دیتا۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ وہ باب اس نے اندرا گاندھی سے متعلق لکھا تھا۔ ایک خبر یہ ہے کہ یہ باب خفیہ طور پر مارکیٹ میں چل رہا ہے اور بڑا مقبول ہو رہا ہے۔

متھائی سے جب پوچھا گیا کہ کیا یہ بات صحیح ہے کہ فیروز گاندھی نے بہت سے لوگوں سے کہا تھا کہ نہرو کا اصلی داماد تو متھائی ہے، میں نہیں۔ تو اس نے مسکراتے ہوئے اس کی تصدیق کی اور کہا ہاں وہ بہت سے لوگوں سے یہ کہتے پھرتے تھے، لیکن میرے اور اندرا گاندھی کے جو تعلقات تھے، اس سلسلے میں کچھ نہیں بولوں گا۔ ویسے میں نے اندرا کے بارے میں ایک باب لکھا تھا۔ اس کے بارے میں، میں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ کوئی بدل نہیں سکتا، کیونکہ مجھ سے زیادہ اس کو قریب سے کوئی نہیں جانتا۔

اس بات کا آپ کیسے دعویٰ کر سکتے ہیں؟

متھائی: میں اور اندرا ایک مکان میں ایک چھت کے نیچے تیرہ سال تک رہے ہیں۔" اس لیے آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں۔ متھائی نے کئی اور سوالوں کے جواب میں اور بھی بہت سی باتیں بتائی ہیں جن کا خلاصہ ہم پیش کر رہے ہیں مثلاً وجے لکشمی پنڈت کو وہ اکثر چینی کھانا کھلانے "فجیا" نامی ایک ریسٹورنٹ میں لے جایا کرتا تھا۔

رفیع احمد قدوائی کے بارے میں اس نے کہا کہ وہ رشوت لیتے تھے مگر وہ بدعنوان نہیں تھے، کیونکہ انہوں نے جو پیسہ لیا، غریبوں میں بانٹ دیا۔ جب وہ مرے تو ان کے پاس کچھ نہیں تھا اور وہ ایک غریب آدمی کی طرح اپنے پیچھے کچھ نہیں چھوڑ گئے۔

کرپشن کے بارے میں انہوں نے کہا کہ پہلے اتنا کرپشن نہیں تھا۔ اصلی کرپشن اندرا گاندھی کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد شروع ہوا۔

شردھا ماتا کے بارے میں جو کچھ متھائی نے لکھا ہے اور اسے نہرو کی ناجائز اولاد کی ماں بتایا ہے، اس کی نہرو کے دوسرے سیکرٹری اپادھیائے نے بڑی سخت تردید کی ہے اور بتایا ہے کہ شردھا ماتا، نہرو سے ایک بار ضرور ملی ہے اور وہ اس وقت خود وہاں موجود تھا۔ جب متھائی کو یہ بات بتائی گئی تو اس نے کہا کہ اپادھیائے بیوقوف ہے وہ کچھ نہیں جانتا۔ متھائی نے یہ سنسنی خیز انکشاف کیا ہے کہ جب نہرو مرے تو ایک خوبصورت لڑکا آیا۔ اور اس نے کہا کہ میں اپنے باپ کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ گلزاری لال نندہ اس لڑکے کو سمجھا بجھا کر باہر لے گئے۔ پھر پتہ نہیں وہ لڑکا کہاں گیا۔

جب ان سے پوچھا گیا کہ سنا ہے کرشنا مینن عورتوں میں بڑے مقبول تھے تو اس نے زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا، یہ کیسے ہو سکتا ہے، وہ تو اس قابل تھے ہی نہیں۔ دوسرے الفاظ میں متھائی نے کرشنا مینن کو نامرد ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

پتہ نہیں متھائی پنر جنم میں یقین رکھتے ہیں یا نہیں، لیکن اگر واقعی وہ مرنے کے بعد دوبارہ پیدا ہوئے تو ان کے جسم کو یقیناً کتے اور گھوڑے کی شکل تو نہ مل سکے گی، کیونکہ یہ دونوں جانور وفاداری کے پتلے ہیں، البتہ یہ ممکن ہے کہ ان کے خمیر سے نہ جانے کتنے طوطوں کی آنکھیں اور نہ جانے کتنی عیار لومڑیوں کے دماغ تشکیل پائیں گے۔

★★

خط

ایک پہلو یہ بھی ہے "آزاد" کی تصویر کا

گذشتہ دنوں آپ نے اپنے پرچے میں مرحوم ابوالکلام آزاد کے بارے میں ایک نوٹ لکھا ہے، جو اس خط کا محرک بنا۔ مولانا کی زندگی کا ایک پہلو تو وہ ہے جو ان کے "بعض کرم فرماؤں" کی طرف سے لوگوں کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے اور جس کے بارے میں آپ کو احتجاجی نوٹ لکھنا پڑا، ایک اور پہلو وہ ہے جو شاید اکثر لوگوں کی نگاہ سے اوجھل ہے، کچھ تعجب نہیں کہ یہ پہلو قارئین "صحافت" کے لیے اپنے اندر دلچسپی کا سرو سامان رکھے۔

مدراس میں جمال محمد نامی کالج کے پرنسپل محمد سعید کے پاس مولانا آزاد مرحوم کا قیام تھا، اس قیام کے بارے میں سعید صاحب نے لکھا: "ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ رات کا وقت ہے، مولانا کا کمرہ کھلا ہوا ہے، بستر موجود ہے، مگر مولانا غائب، سوچا کہ کہیں طبیعت ناساز نہ ہو، اس خیال سے مولانا کی تلاش شروع کی، دیکھا کہ کوٹھی کے منبر سے پر جہاں چاندنی کا قدرتی فرش بچھا ہوا تھا، مولانا سر برہنہ خدا کے حضور میں ہیں، بڑی طویل نماز تھی، قیام اور رکوع میں جتنی دیر لگاتے اس سے کچھ زیادہ دیر سجدے میں لگاتے۔ بہت دیر تک اس محویت میں نماز ادا کرتے رہے اور میں ہمہ تن ان کی اس کیفیت سے مستفید ہوتا رہا۔ آخر جب دیکھا کہ دیر ہو گئی ہے اور مولانا کا ذوق و شوق بڑھتا ہی جاتا ہے تو کسی قدر تذبذب کے بعد ان تک پہنچا اور آرام کرنے کی درخواست کی، مولانا نے جواب دیا، "میرے بھائی! مجھے میری دیوانگی میں چھوڑ دو اور تم جا کر سو رہو"۔ (نقد ابوالکلام از رضی الدین احمد، میرٹھ، ص ۱۰۰۰)

مولانا مرحوم کی اس کہانی سے مماثل دوسری کہانی یاد آئی، ابن حداد نے لکھا ہے کہ میں ایک چاندنی رات میں امام احمد بن حنبلؒ کی قبر کی طرف گیا، دور سے ایک آدمی جو قبلہ رخ کھڑا تھا، نظر آیا۔ جب میں اس کے پاس آیا، دیکھا کہ وہ حسین بن منصور ہے جو روتا ہوا یہ کہہ رہا تھا: "اے وہ ذات جس نے مجھے اپنی محبت میں مدہوش کر دیا ہے اور اپنی قربت میں لا کر حیرت میں ڈال دیا ہے، تو ہی قدیم ہونے کی حیثیت سے منفرد ہے اور مقام صدق پہ تو ہی اکیلا فائز ہے ..... میں اس مقدس مٹی کی حرمت کے نام پہ آپ سے سوالی ہوں کہ تم نے مجھ کو مجھ سے چھین لیا ہے، اب مجھے میری طرف واپس نہ کرنا اور میرے نفس کو جو مجھ سے حجاب میں کر دیا گیا ہے، مجھے نہ دکھانا۔ تیرے شہر میں میرے دشمنوں میں اضافہ کرنا ایسا ہی تیرے بندوں میں جو میرے قتل کے درپے ہیں"

دوسرے دن صبح کے وقت میں نے منصور کو جامع منصور میں دیکھا تو وہ مجھے ہاتھ پکڑ کر ایک کونے کی طرف لے گئے اور کہا "تجھے خدا کی قسم! تم نے مجھے رات جس حالات میں دیکھا اس سے کسی کو آگاہ نہ کرنا۔

(اخبار حلاج، پیرس ۱۹۳۶، ص ۱۷، مرتبہ ماسینوں)

مولانا مرحوم کی یہ تو تھی پرائیویٹ زندگی، جس کی گواہی ان کی موت کے بعد ان کے میزبان نے دی۔ ان کی اجتماعی زندگی کے بارے میں فرانس کے ممتاز اور معروف سکالر ماسینوں نے ۱۹۵۸ء میں لکھا کہ میں ۱۸ جنوری ۱۹۵۳ء کو دہلی میں جہاں میں بین الاقوامی کانفرنس میں آیا تھا، مولانا سے ملا۔ وہ مجھے دوپہر کے کھانے کے لیے اپنے گھر لے گئے۔ ہم دونوں کی زندگیوں کا بنیادی حصہ ختم ہو چکا ہے اور یہ ہماری دوسری میٹنگ تھی۔ یاد رہے ماسینوں اور آزاد دونوں ۱۹۰۸ء میں بغداد میں اکٹھے تھے، ہم دونوں کو یہ شدت سے احساس تھا کہ دنیا میں تیسری طاقت کی حیثیت سے اسلام کے لئے ایک چانس حاصل کیا جائے، اور ایسا ہی مسلم اقلیتوں، ان کے حقوق اور ان کی امیدوں کے لیے مولانا نے ہندوستان میں اور میں نے شمالی افریقہ میں یہ کام کیا۔ ہم دونوں کی یہ رائے تھی کہ اجتماعی اصلاح کے لیے سلفیہ کے طریقہ کار کو مضبوط بنیاد بنانا چاہیے"۔

(آزاد از ہمایوں کبیر، دہلی ۱۹۵۹ ص ۲۸)

ہندوستان کی تقسیم کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کو فسطائی طاقتوں سے بچانے کے لیے مولانا آزاد نے جو کچھ کیا، اس کی گواہی تو جامع مسجد دہلی اور لال قلعہ ہی دے سکتے ہیں، البتہ وہ اپنی وفات پہ مقروض تھے کہ ان کی ساری دولت بیوہ عورتوں اور غریبوں میں تقسیم ہو گئی تھی، اس امر کا انکشاف بھارت کی پارلیمنٹ میں خود جواہر لال نہرو نے ۱۹۵۸ء میں کیا۔

سقراط نے یونان کی عدالت میں بیان دیتے ہوئے کہا تھا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، اس پہ صداقت کی سب سے بڑی دلیل میری غریبی اور فقر ہے۔ ابوالکلام آزاد بھی بجا طور پہ سقراط کی اس دلیل کو دہرا سکتے ہیں۔ سقراط نے بڑھاپے میں جو کچھ عدالت میں کہا تھا، ابوالکلام نے اسے اپنے عین شباب میں کلکتہ کی عدالت میں کہا تھا، جو آج "قول فیصل" کے نام سے ہمارے پاس ہے۔

(رشید احمد جالندھری، اسلام آباد)

چھپتے چھپتے

مسٹر بھٹو

کو موت کی سزا

۱۸ مارچ ۷۸ء کی صبح لاہور ہائی کورٹ کے فل بنچ نے نواب محمد احمد خاں کے قتل کے سلسلے میں مسٹر بھٹو اور چار ملزموں میاں محمد عباس، انسپکٹر غلام مصطفےٰ، انسپکٹر رانا افتخار اور انسپکٹر ارشد اقبال کو موت کی سزا سنائی۔ فیصلے کو مسٹر جسٹس آفتاب حسین نے لکھا اور باقی ججوں نے اس سے اتفاق کیا۔ فیصلے کا متن ۴۱۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ ملزموں کو سات دن کی مہلت دی گئی ہے کہ وہ اس عرصے میں سپریم کورٹ میں اپیل کر سکتے ہیں۔

خواجہ صباح

مطالعے کی میز پر

محمد علی ـــــ پہلی فتح سے آخری شکست تک

محمد علی نسلاً آئرش ہیں۔ ان کے دادا کاسیئس مرکولیس کلے امریکی سیاست میں بھی خاصے دخیل رہے۔ ابراہام لنکن کے زمانے میں انہوں نے نائب صدر کے عہدے کے لیے انتخاب لڑا۔ کامیاب بھی ہوئے، مگر امریکہ کے سفید فام نسل پرستوں نے یہ کہہ کر انہیں اس عہدے پر دیکھنے سے انکار کر دیا کہ وہ انتہا پسند ہیں۔ محمد علی کے والد کاسیئس ہینیٹر اگرچہ خاصا کماتے تھے، لیکن امریکہ کے دوسرے سیاہ فام لوگوں کی طرح انہیں بھی کوئی سماجی مرتبہ حاصل نہیں تھا، چنانچہ اسی وجہ سے وہ اکھڑے اکھڑے، چڑچڑے اور تنک مزاج تھے۔

۱۷ جنوری ۱۹۴۲ء کو محمد علی کاسیئس ہینیٹر کے گھر پیدا ہوئے۔ اس زمانے میں یہ خاندان ایک قصبہ لوئیس ویل میں رہائش پذیر تھا۔ بچے کا نام کاسیئس کلے رکھا گیا۔ بچپن میں محمد علی عام بچوں کی نسبت خاصا موٹا تازہ اور صحت مند تھا۔ حتیٰ کہ تین سال کی عمر میں وہ اپنی عمر سے بڑا لگتا تھا اور ان کی والدہ انہیں لے کر جب بھی بس یا ریل میں سفر کرتیں تو انہیں اپنے بچے کے لیے آدھا ٹکٹ لینا پڑتا تھا، کیونکہ کوئی بھی کنڈیکٹر یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا تھا کہ یہ بچہ تین سال کی عمر کا ہے۔

محمد علی کی والدہ اوڈیسیالی گریڈی کلے ایک بلند کردار خاتون تھیں۔ ان کی زندگی صرف گھر کے لئے مخصوص تھی اور وہ باہر نہیں جاتی تھیں۔ انہوں نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت اخلاقی اصول و ضوابط کے تحت کی۔ ان کی ماں نے انہیں سچ بولنا سکھایا۔ انہیں بدکرداری سے نفرت تھی، چنانچہ انہوں نے اپنے بچوں کی تعمیرِ کردار پر بڑی توجہ دی۔

محمد علی پندرہ سال کے ہوئے تو ان کے والد نے انہیں ایک سائیکل لے دی۔ محمد علی سائیکل پا کر بڑے خوش ہوئے۔ ایک روز وہ اپنی سائیکل پر میلہ دیکھنے گئے۔ وہاں سائیکل ایک جگہ رکھی اور خود میلے کی رنگینیوں میں کھو گئے۔ شام کو جب وہ اس جگہ آئے جہاں سائیکل رکھی تھی تو یہ دیکھ کر بڑے پریشان ہوئے کہ سائیکل غائب ہے۔ انہوں نے سارا میلہ چھان مارا مگر سائیکل نہ ملی۔ اسی اثنا میں انہیں ایک سپاہی ملا۔ محمد علی نے اسے سائیکل کی گمشدگی کے بارے میں بتایا۔ سپاہی نے کہا کہ اب سائیکل کا ملنا مشکل ہے، لہٰذا اسے بھول جاؤ۔ محمد علی یہ سن کر تڑپ اٹھے اور بولے: "اگر مجھے سائیکل چرانے والا مل جائے تو میں اسے مار مار کر اس کا حلیہ بگاڑ دوں"۔ سپاہی نے ہنس کر کہا: "اس کے لیے بھی طاقت کی ضرورت ہے، کیونکہ طاقتور انسان ہی اپنی چیزوں کی حفاظت کر سکتا ہے"۔ اس واقعے کے بعد محمد علی نے تہیہ کر لیا کہ وہ کمزور بن کر نہیں جئے گا۔ طاقت حاصل کرے گا۔

باکسنگ کا شوق

اب محمد علی نے باکسر بننے کا ارادہ کیا۔ اور لوئیس ویل کے مارٹن جیمنیزیم میں جانا شروع کر دیا۔ سکول جانے کے ساتھ ساتھ انہوں نے تین سال تک باکسنگ کی مشق جاری رکھی۔ محمد علی کو باکسنگ سیکھنے کا جنون تھا۔ مارٹن جیمنیزیم میں انہیں مشق کرتے دیکھ کر لوگ حیران ہو جاتے تھے۔ لوئیس ویل میں ہونے والے باکسنگ کے شوقیہ مقابلوں میں انہیں زبردست کامیابی نصیب ہوئی اور وہ شکاگو کے چیمپئن ٹورنامنٹ کے کوارٹر فائنل میں پہنچ گئے، لیکن اتفاق سے آسٹریلیا کے ایک باکسر ٹونی ماڈیگان نے انہیں ہرا دیا۔ اس شکست سے محمد علی کا شوق دو چند ہو گیا، انہوں نے مشق تیز کر دی اور بالآخر ۱۹۶۰ء کے اولمپکس میں ہیوی ویٹ کی چیمپئن شپ جیت کر سونے کا تمغہ حاصل کر لیا۔

اولمپکس مقابلوں میں پہلے انہوں نے بیلجیم کے چیمپئن ای بیکاکس کو دوسرے راؤنڈ میں ہی ہرا دیا، پھر روسی باکسر

شیفکوف کو شکست دی۔ اس کے بعد محمد علی کے پرانے رقیب آسٹریلیا کے ٹون ماڈیگان کی باری آئی، لیکن محمد علی نے اپنی کاری ضربوں سے اسے نڈھال کر دیا۔ آخری مقابلہ پولینڈ کے چیمپئین کاداسکی سے تھا۔ ماہرین نے کہنا شروع کر دیا کہ کاداسکی کو ہرانا بہت مشکل ہے، کیونکہ وہ دو سو پچاس مقابلوں میں کامیابی حاصل کر چکا ہے اور بائیں ہاتھ سے مکہ مارنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ دونوں رنگ میں اترے۔ محمد علی نے پہلے راؤنڈ میں کاداسکی کے ہر حملے کو ناکام بنایا اور دوسرے راؤنڈ میں اس پر اتنے مکے برسائے کہ کاداسکی لہو لہان ہو گیا۔ جب مقابلے کا آخری راؤنڈ ختم ہوا تو کاداسکی نڈھال ہو کر رنگ کے رسوں کا سہارا لیے کھڑا تھا، اور تماشائی محمد علی کی تعریف میں پوری قوت اور جوش و خروش سے نعرے لگا رہے تھے۔

سونے کا تمغہ حاصل کر کے محمد علی کو بڑی مسرت ہوئی۔ پورا دن انہوں نے یہ تمغہ گلے میں پہن کر روم کے بازاروں کا چکر لگایا۔ حتیٰ کہ رات کو سوتے ہوئے بھی تمغہ گلے میں ڈالے رکھا۔

ابتدائی مقابلے

انہی دنوں ہیوی ویٹ چیمپین فلائیڈ پیٹرسن اولمپکس مقابلے دیکھنے کے لیے روم آیا ہوا تھا۔ محمد علی نے اسے دیکھا تو لپک کر اس کی طرف بڑھا اور کہا "پیٹرسن ایک دن آئے گا کہ تم میرے ہاتھوں پٹو گے" پیٹرسن نے مسکرا کر جواب دیا "تم ایک ہونہار لڑکے ہو اور ہونہار لڑکے محنت جاری رکھتے ہیں"، محمد علی نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا "لیکن کل تمہیں میری عظمت کا قائل ہونا پڑے گا" مقابلوں کے بعد محمد علی جب امریکہ پہنچے تو ایک ہیرو کی طرح ان کا استقبال کیا گیا۔ نیویارک میں چند روز تک قیام کرنے کے بعد وہ لوئیس آ گئے۔ اب انہوں نے پیشہ ورانہ باکسنگ کا آغاز کیا اور اس مقصد کے لیے اینجلو ڈنڈی کی تربیت گاہ سے منسلک ہو گئے۔ اینجلو ڈنڈی نے نہیں کچھ عرصہ تربیت دینے کے بعد ان کا پہلا قابل ذکر مقابلہ ۹ اپریل ۶۰ء کو لوئیس ویل میں ہی پختہ کار باکسر لیمر کلارک سے کر دیا۔

پہلے راؤنڈ میں ہی محمد علی نے لیمر کلارک کو اتنے خوفناک پنچ مارے کہ وہ تین مرتبہ رنگ میں گرا اور پھر اٹھ کر سامنے آیا۔ دوسرے راؤنڈ میں محمد علی کے ایک پنچ سے کلارک ایسا گرا کہ پھر نہ اٹھ سکا۔ اس کے بعد ان کا مقابلہ لاس ویگاس میں ہوائی کے باکسر کو لو سے اور پھر نیویارک میں سونی بینکس سے ہوا۔ انہوں نے دونوں کو شکست دی۔ ان مقابلوں میں محمد علی نے اپنی خاص تکنیک "تتلی کی طرح رقص اور شہد کی مکھی کی طرح ڈنک"

پر پوری طرح عمل کیا۔ کچھ عرصے کے بعد انہوں نے ڈان وگز، آرچی مور اور چارلی پاول کو بھی ہرا دیا۔

۱۳ مارچ ۱۹۶۳ء کو محمد علی نے نیویارک میں ڈگ جونز کو دسویں راؤنڈ میں پوائنٹس پر ہرایا اور ۱۸ جون کو لندن میں یورپ کے چیمپین ہنری کوپر کو پانچویں راؤنڈ میں ٹیکنیکل ناک آؤٹ کر دیا۔ یہ مقابلہ انتہائی دلچسپ تھا۔ جب محمد علی لندن پہنچے تو ہوائی اڈے پر اخبار نویسوں نے انہیں بتایا کہ ہنری کوپر تو خونخوار بھیڑیا ہے۔ محمد علی نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا کہ میں ہنری کوپر کو اپنے مقابلے کا باکسر نہیں سمجھتا۔ میں اس بدصورت بڈھے ریچھ سونی لسٹن سے مقابلہ کرنے سے پہلے لندن میں آرام کرنے کے لیے آیا ہوں، برطانوی اخبار نویس بڑے برہم ہوئے، کیونکہ ہنری کوپر پوری سفید فام قوم کا نمائندہ تھا۔ محمد علی نے اخبار نویسوں کو مزید چڑانے کے لیے کہا کہ ہنری کوپر پانچویں راؤنڈ میں بے بس ہو جائے گا اور ہوا بھی یہی۔

یہ مقابلہ دیکھنے کے لئے دنیا بھر سے بے شمار تماشائی لندن پہنچے۔ ان میں ہالی وڈ کی مشہور اداکارہ الزبتھ ٹیلر اور اس کا خاوند رچرڈ برٹن بھی تھا۔ پہلا راؤنڈ ختم ہوا تو ہنری کوپر اعتماد سے اپنے کونے میں آیا، لیکن دوسرا راؤنڈ شروع ہوتے ہی محمد علی نے اپنی خاص تکنیک پر عمل کرتے ہوئے ہنری کوپر پر پے در پے وار کئے کہ وہ بوکھلا اٹھا، چوتھے راؤنڈ میں محمد علی کے مکوں سے ہنری کوپر کا چہرہ لہو لہان ہو گیا اور رنگ کے قریب بیٹھنے والے تماشائیوں پر خون کے چھینٹے پڑنے لگے۔

یہ دیکھ کر الزبتھ ٹیلر سمیت مقابلہ دیکھنے والی تمام عورتیں چیخ اٹھیں اور ریفری سے مقابلہ بند کرانے کی درخواست کرنے لگیں، مبصرین کا کہنا ہے کہ اگر یہ مقابلہ بند نہ کرایا جاتا تو ہنری کوپر کی موت واقع ہو جاتی، چنانچہ مقابلہ بند کرا کے محمد علی کو فاتح قرار دے دیا گیا۔

بلیک مسلم تحریک اور قومی اسلام

اسی اثنا میں امریکہ میں بلیک مسلم تحریک تیزی سے پھیل رہی تھی۔ محمد علی بھی اس تحریک میں شامل ہو گئے۔ سیاہ فام مسلمانوں کے رہنماؤں مالکم ایکس اور عالیجاہ محمد کی کاوشوں سے محمد علی بھی مسلمان ہو گئے، لیکن ابھی انہوں نے اپنے عقائد کا اظہار نہیں کیا تھا۔ ۱۹۶۴ء میں سونی لسٹن سے مقابلے کا دن قریب آیا تو پوری دنیا کی نظریں اس مقابلے پر لگ گئیں۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی بڑا واقعہ ہونے والا ہے۔ مقابلے سے چند روز قبل مسلم رہنما مالکم ایکس نے کہا، "یہ پہلا موقع ہے کہ ایک مسلمان ایک عیسائی سے باکسنگ کا مقابلہ کر کے پوری دنیا کے سامنے آخری صداقت کا اظہار کرنے والا ہے"

مالکم ایکس کے اس بیان سے سفید فاموں میں طرح طرح کی باتیں ہونے لگیں اور کہا جانے لگا کہ محمد علی بلیک مسلم تحریک کا نمائندہ ہے، چنانچہ مقابلے کی اہمیت بڑھ گئی اور یورپی عیسائی دنیا میں سونی لسٹن کی کامیابی کی دعائیں مانگی جانے لگیں۔ مقابلے کے روز میامی بیچ میں تماشائیوں کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ محمد علی رنگ میں آئے تو وہ نئی طاقتوں سے سرشار تھے۔ انہوں نے سونی لسٹن کو للکارا "میں تتلی کی طرح رقص کروں گا اور شہد کی مکھی کی طرح ڈنک ماروں گا۔ کہاں ہے وہ گندا، بھدا اور بدصورت ریچھ"۔ محمد علی مسلسل ایک گھنٹے تک رنگ میں رقص کرتا رہا اور گرجتا رہا۔ حتیٰ کہ لوگ سوچنے لگے کہ کہیں یہ دماغی ہیجان میں تو مبتلا نہیں ہو گیا۔ ڈاکٹروں نے فوری طور پر محمد علی کا طبی معائنہ کیا اور بتایا کہ خون کا دوران بالکل نارمل ہے اور دماغی ہیجان کی کوئی علامت نہیں۔

سونی لسٹن سے مقابلہ

مقابلہ شروع ہونے کی گھنٹی بجی۔ سونی لسٹن سامنے آیا تو محمد علی نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا "فتح میرا مقدر ہے۔ کوئی مجھے شکست نہیں دے سکتا" پہلے راؤنڈ میں ہی محمد علی نے سونی لسٹن کو بوکھلا دیا۔ دوسرے راؤنڈ میں اس کی سدھ بدھ جاتی رہی اور ساتویں راؤنڈ میں وہ بت کی طرح یوں گرا کہ پھر نہ اٹھ سکا۔ اس مقابلے کے بعد ہی محمد علی نے رنگ میں اعلان کیا کہ "میں عیسائی نہیں مسلمان ہوں۔ میرا نام کاسئیس کلے نہیں، محمد علی ہے"۔ ان کا یہ پیغام عیسائی دنیا بالخصوص امریکہ میں نہایت دھماکہ خیز ثابت ہوا۔ اس کے ساتھ ہی محمد علی نے یہ بھی کہا کہ مجھے اپنے سیاہ فام ہونے پر فخر ہے۔ سیاہ فاموں کو حقیر سمجھنے والا سفید فام سامراج سن لے کہ سیاہ فام زیادہ خوبصورت ہوتے ہیں کیونکہ وہ تنگ نظر، کینہ پرور اور متعصب نہیں ہوتے۔ کالے رنگ میں حسن ہے۔ بلیک از بیوٹی فل — لسٹن کی شکست سے پورے امریکہ بلکہ پورے یورپ میں انتہائی رسوائی محسوس کی گئی۔ سفید فام حلقے جو زندگی کے ہر اعزاز کا مستحق سفید فاموں کو یا پھر عیسائیوں کو ہی سمجھتے تھے، محمد علی کو عالمی اعزاز سے محروم کرنے کے لیے سازشیں کرنے لگے، چنانچہ ۱۹۶۵ء میں سونی لسٹن کو پھر محمد علی کے مقابلے میں لایا گیا۔

محمد علی نے اعلان کیا کہ اس مرتبہ میں اس غلیظ ریچھ کا یوں شکار کروں گا کہ وہ پھر کسی سے مقابلے کی جرأت نہ کر سکے گا۔ میں اسے ایک ہی راؤنڈ میں ناک آؤٹ کر دوں گا۔ مخالفوں نے اسے لاف زنی قرار دیا، لیکن ۲۵ مئی

۱۹۶۵ء کو جب دونوں حریف رنگ میں آمنے سامنے ہوئے تو محمد علی نے پہلے راؤنڈ میں لسٹن کو ایک ایسا بھرپور پنچ مارا کہ وہ بے سُدھ ہو کر زمین پر گر گیا۔ یہ واقعہ آناً فاناً ہوا۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ محمد علی واقعی پہلے راؤنڈ میں سونی لسٹن کو ناک آؤٹ کر دیگا۔ اکثر تماشائیوں نے تو ابھی اپنی دوربینیں بھی نہیں نکالی تھیں کہ لسٹن زمین پر گر گیا۔ ریفری اتنا متعجب ہوا کہ گنتی بھول گیا اور جب اسے احساس ہوا تو اس نے دوبارہ گنتی شروع کر دی، لیکن لسٹن اٹھ نہ سکا اور محمد علی نے اپنی برتری ایک مرتبہ پھر ثابت کر کے سفید فام حلقوں میں صفِ ماتم بچھا دی۔

عالمی ہیرو

اب محمد علی پوری دنیا کے ہیرو بن چکے تھے۔ ان کے دوسرے مقابلوں کی تفصیل یہ ہے۔ ۲۲ نومبر ۱۹۶۵ء کو لاس ویگاس میں انہوں نے فلائیڈ پیٹرسن کو بارھویں راؤنڈ میں ناک آؤٹ کیا۔ ۲۸ مارچ ۱۹۶۶ء کو ٹورنٹو میں جارج شوالو کو پندرہ راؤنڈ کے مقابلے میں پوائنٹس پر شکست دی۔ ۲۱ مئی ۱۹۶۶ء کو لندن میں ہنری کوپر کو دوبارہ شکست دی۔ ۶ اگست ۱۹۶۶ء کو لندن میں ہی برین لنڈن کو تیسرے راؤنڈ میں ناک آؤٹ کیا — ۱۰ ستمبر ۱۹۶۶ء کو فرینکفرٹ میں کارل ملڈن برگر کو بارھویں راؤنڈ میں ٹیکنیکل ناک آؤٹ کیا۔ ۶ فروری ۱۹۶۷ء کو ہوسٹن میں ارنی ٹیرل کو پندرہ راؤنڈز کے مقابلے میں پوائنٹس پر ہرایا اور ۲۲ مارچ ۱۹۶۷ء کو نیویارک میں زورا فولی کو ساتویں راؤنڈ میں ناک آؤٹ کیا۔

چند مشہور مقابلے

اس کے بعد امریکہ کے سفید فام حکمرانوں نے انہیں سیاسی طور پر عالمی اعزاز سے محروم کر دیا کیونکہ وہ محمد علی کو جھکا نہیں سکتے تھے۔ کچھ عرصہ تک وہ مقابلے نہ کر سکے، لیکن بالآخر انہوں نے عالمی چیمپئن شپ دوبارہ حاصل کر لی۔ اس دور میں انہوں نے صرف دو مرتبہ پہلے جو فریزیئر سے اور پھر کین نارٹن سے شکست کھائی، مگر دوبارہ مقابلوں میں انہیں ہرا دیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے جیری کیوری، آسکر بوناوینا، جمی ایلیس، بوب ماتھیس، ال لیوس، فلائیڈ پیٹرسن، بوب فوسٹر، جو بگنر، روڈی لوبیرز، جارج فورمین، چک ویپنر اور ران للی کو ہرایا۔ انہوں نے جو فریزیئر اور جو بگنر کو دو دو مرتبہ شکست دی۔

ان کا آخری مقابلہ لیون سپنکس سے ہوا۔ ★

لیون سپنکس سے آخری مقابلہ

محمد علی ناتوانی کے عالم میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کا جسم درد کے تھپیڑے سہہ رہا تھا، چہرہ خراشوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کی بیوی ویرونیکا خاوند کے گھٹنوں پر سر رکھے پاس ہی بیٹھی تھی۔ دونوں کے گرد دوستوں کا حلقہ تھا۔ محمد علی کے چھوٹے بھائی رحمٰن علی نے چلا کر کہا "بھائی! میں سچ کہتا ہوں کہ مقابلے کے منصفوں نے آپ سے انصاف نہیں کیا۔ ان لوگوں نے دھوکے اور فریب سے آپ کو عالمی چیمپئن کے اعزاز سے محروم کیا ہے۔ انہوں نے آپ کو لوٹ لیا ہے"۔

محمد علی نے رحمٰن کو غصّے سے گھورتے ہوئے کہا:

"خاموش رہو اور فضول باتیں مت کرو، میں واقعی ہار گیا ہوں اور نہیں چاہتا کہ تم لوگ میری شکست کے لیے عذر تلاش کرو"۔

نیچے ہال میں لیون سپنکس کا ڈریسنگ روم اس کے مداحوں سے بھرا ہوا تھا۔ جو بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے تھے۔ اچانک سپنکس نے سب کو خاموش کرتے ہوئے کہا: "آئیں پہلے کرنے والا کام پہلے کر لیں۔ ہر شخص میرے ساتھ دعا مانگے"۔

چند لمحوں کے بعد اس نے چیمپئن شپ کی پیٹی پہنی۔ آئینے میں دیر تک اپنا عکس دیکھا اور پھر پکار اٹھا "اب میں عالمی ہیوی ویٹ چیمپئن ہوں"۔

کوئی چلایا، "تم عظیم ترین ہو"۔

سپنکس نے نفی میں سر ہلایا:

"نہیں میں عظیم ترین نہیں ہوں۔ عظیم ترین صرف علی تھا۔ دوسرے کھلاڑیوں کے برعکس محمد علی ہارا بھی باوقار انداز میں ہے"۔

لاس ویگاس میں گذشتہ ہفتے ہیوی ویٹ چیمپئن شپ کے اس مقابلے میں ہارنے کے بعد علی نے سپنکس سے کہا: "آج رات تم نے پوری دنیا کو متحیر کر دیا ہے"۔

"بالکل اسی طرح جس طرح آپ دنیا کو متحیر کیا کرتے تھے" سپنکس نے مسکراتے ہوئے کہا: "بہرکیف اس تحسین پر آپ کا شکر گزار ہوں"۔

علی پر سپنکس کی فتح نے کھیل کی تاریخ کو الٹا کر دیا ہے۔ اس سے قبل ۱۹۳۵ء میں جیمز جے بریڈک نے میکس بیر کو اسی طرح ہرایا تھا اور وہ پہلا موقع تھا جب ایک عالمی چیمپئن منصفوں کے فیصلے کے باعث اپنے عالمی اعزاز سے محروم ہوا۔ سامنے کے دو ٹوٹے ہوئے دانتوں والے چیلنجر سپنکس کے جیتنے کی لوگوں کو اتنی کم امید تھی کہ اس پر لگائی جانے والی شرطوں کی شرح دس کے مقابلے میں ایک تھی، لیکن اس کی فتح سے پوری دنیا انگشت بدنداں رہ گئی۔ لوگ یہی سمجھتے تھے کہ سپنکس نے محض اپنی قدر و قیمت بڑھانے کے لیے علی کو چیلنج کیا ہے۔ حتیٰ کہ اس کی ماں نے بھی اسے انتباہ کیا کہ علی سے نہ لڑے۔ اس کی ماں نے کہا تھا:

"علی کے مقابلے میں تم بہت کم ہو۔ تم پاگل ہو گئے ہو لیون، علی تمہیں پیس کر رکھ دے گا۔"

ہیوی ویٹ چیمپئن
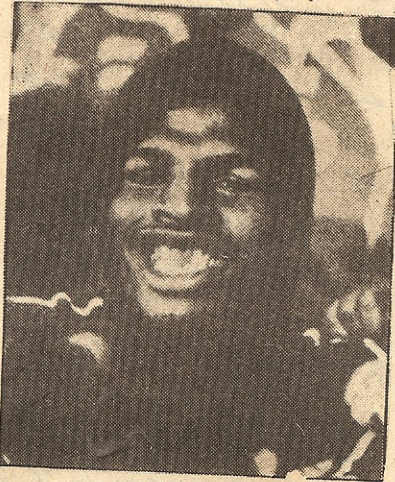
خود علی کو بھی اپنی جیت کا کامل یقین تھا، لیکن وہ بھی جانتا تھا کہ چوبیس سالہ سپنکس کی ضرب کافی خوفناک ہوتی ہے۔ مزید برآں علی مقابلے میں جو داؤ استعمال کرتا ہے وہ اب راز نہیں رہے۔ علی سوچ رہا تھا کہ ابتداء میں یہ لڑکا مجھے پنچ ماریگا، لیکن آخری راؤنڈز میں شکست یقیناً اس کا مقدر ہو گی۔ چنانچہ وہ اپنی عادت کے برعکس عوام کے سامنے خاموش رہا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ انٹرویو لینے والوں سے تنگ آ چکا ہے۔ اس کا وزن خاصا زیادہ تھا، تاہم تربیتی کیمپ میں ورزش کر کے اس نے وزن گھٹا لیا۔ جب وہ رنگ میں اترا تو اس کا وزن ۲۲۴ پونڈ تھا اور اس کے مقابلے میں سپنکس کا وزن

وزن ۱۹۷ ۱/۴ پونڈ تھا۔

سپنکس مقابلے سے تین روز قبل تک مختلف انداز کی ضربیں لگانا سیکھتا رہا۔ علی کے مقابلے میں وہ رنگ میں اُترا تو اگرچہ قدوقامت اور تجربے میں علی کے پائے کا نہ تھا، تاہم اس کی سکت اور قوتِ برداشت کہیں زیادہ تھی۔ ابتدا میں وہ کچھ دبا رہا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس جال میں پھنس گیا ہے جو علی نے اس کے لیے پھیلایا تھا، تاہم جب علی رسّوں کا سہارا لیتا تو سپنکس اپنے تیز و تند حملے جاری رکھتا، اس طرح اس کے پوائنٹ بڑھتے گئے۔ درمیان کے راؤنڈز میں علی نے چاروں طرف گھومتے ہوئے حریف پر مکّے برسانے کی تیکنیک استعمال کی۔ ابھی تک اس کے چہرے پر تھکاوٹ کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ حتیٰ کہ دسویں راؤنڈ میں بھی علی ناقابلِ شکست دکھائی دے رہا تھا۔

لیکن پھر پانسہ پلٹتا نظر آنے لگا اور علی کے مکّے سپنکس کو آگے بڑھ کر وار کرنے سے نہ روک سکے، حالانکہ یہ وہی علی تھا جس کے خوفناک مکّوں نے کین نارٹن، جمی ینگ اور ارنی شیورز کو حواس باختہ کر دیا تھا۔

سپنکس علی کو مار رہا تھا، بڑھ بڑھ کر حملے کر رہا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے اُس نے ہارنے سے انکار کر دیا ہے۔

اس نے علی کے کئی مکّے اپنے چہرے پر برداشت کیے اور دائیں ہاتھ سے نہایت ہولناک جوابی حملے کیے۔ آخری راؤنڈ سے قبل علی کے ٹرینر اینجلو ڈنڈی نے علی سے کہا: "بس اب کھیل ختم کرو، سپنکس نے اپنے دل کے ارمان نکال لیے ہیں، اب اسے ناک آؤٹ کر دو۔"

آخری راؤنڈ میں علی نے اپنے مشہور پنچ استعمال کیے، مگر کوئی بھی کاری ثابت نہ ہوا۔ جب آخری راؤنڈ ختم ہونے کی گھنٹی بجی تو علی بمشکل اپنے سٹول تک پہنچا اور جب عالمی چیمپئن کی حیثیت سے سپنکس کے نام کا اعلان ہوا تو علی اُس وقت بھی اپنے سٹول پر بیٹھا ہوا تھا۔

علی کی شکست کے اعلان کے ساتھ ہی پوری دُنیا متحیّر ہو گئی۔ اس اعلان کے بعد علی کے ٹرینر اینجلو ڈنڈی نے کوئی عذر پیش نہ کیا۔ دھیمی آواز میں صرف اتنا کہا: "یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرا کوئی حصہ مجھ سے الگ ہو گیا ہے۔ علی کے ساتھ میں بھی جوان تھا، لیکن لگتا ہے جیسے میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔"

تاہم علی کے چہرے پر مایوسی نظر نہیں آتی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا "میں جیت کر بھی آپ لوگوں کو متعجب کیا کرتا تھا۔ آج ہار کر بھی آپ کو متعجب کیا ہے۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ میں پہاڑ دل پر چلا جاؤں گا، سخت محنت کروں گا اور اپنا عالمی اعزاز واپس لے کر رہوں گا۔ ہر شخص کو ایک نہ ایک دن ہارنا پڑتا ہے، تاہم بلند حوصلہ لوگ اس سے بددل نہیں ہوتے۔ لوگوں کے والدین مر جاتے ہیں، بیویاں مر جاتی ہیں، ٹانگیں کٹ جاتی ہیں، ملازمتیں جاتی ہیں، مگر وہ زندہ رہتے ہیں۔ اپنی کوششیں جاری رکھتے ہیں۔ یقیناً میں وہ پہلا آدمی ہوں گا جو تیسری مرتبہ اپنا اعزاز واپس لے گا۔ میں میکارتھر کی طرح پھر واپس آؤں گا۔"

دوسری طرف سپنکس اپنے کمرے میں اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کے ساتھ شیمپین پی رہا تھا۔ اس مشغلے کے بعد وہ اپنی بیوی نووا کو ساتھ لے کر ایک کلب میں چلا گیا۔ وہ ساری رات نہ سو سکا۔

سپنکس کے قریبی حلقوں کے مطابق اسے رہ رہ کر اپنا ابتدائی زمانہ یاد آ رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ بچپن میں وہ گلی کوچوں میں لونڈوں سے لڑا کرتا تھا، لیکن ان مقابلوں کا کوئی معاوضہ نہیں ملتا تھا۔ اس کے بقول میرا بچپن بڑا تلخ

گزرا ہے۔ میرے باپ نے میری ماں کو طلاق دے دی، چنانچہ میں اور میرے چھ بھائی بہن بے سہارا ہو گئے۔ میرا باپ اکثر یہ کہا کرتا تھا کہ تم ساری زندگی کچھ نہیں کر سکو گے۔ ان دنوں ہم انتہائی غریب ہوتے تھے اور میری ماں کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی تھی کہ ہم سب بہن بھائیوں کو پیٹ بھر کر روٹی مل سکے۔ اپنی محدود آمدنی کے باوجود میری ماں نے مجھے باکسنگ سکھلانے کا انتظام کیا تاکہ میں جھگڑالو لڑکوں کے مقابلے میں اپنی حفاظت کر سکوں۔ میں نے پندرہ برس کی عمر میں باکسنگ کے پہلے ٹورنامنٹ میں حصہ لیا۔ پھر میرین کور میں بھرتی ہوا۔ تاہم باکسنگ کا سلسلہ جاری رکھا۔ پھر میں نے اور میرے بھائی مائک نے پہلی مرتبہ ۱۹۷۶ء کی اولمپک گیمز میں سونے کے تمغے حاصل کر کے اپنے باپ کا دعویٰ غلط ثابت کیا۔ یہ میرا پہلا خواب تھا جو شرمندۂ تعبیر ہوا۔

اولمپک گیمز کے بعد سپنکس نے پروموٹر بوب آرم سے معاہدہ کیا۔ اس نے سات مقابلوں میں حصہ لیا جن میں سے چھ جیتے، جب کہ ساتواں برابر رہا۔ وہ انتہائی نڈر اور بے رحم باکسر ہے۔ اس کے پنچ بڑے طاقتور ہوتے ہیں۔ اس نے علی کے مقابلے کے لیے اپنی تربیت پر پوری توجہ دی، جس کا اسے پھل مل ہی گیا۔

سپنکس کی جیت کے بعد لوگوں کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا وہ ایک اچھا باکسر ہے یا علی کو ہرانے کا موقع اسے خوش قسمتی اور اتفاق سے مل گیا۔ کوئی بھی اس کا جواب یقین سے نہیں دے سکتا، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ سپنکس کو خاصے تجربے کی ضرورت ہے۔ صرف تجربے سے وہ اپنا اعزاز برقرار رکھ سکے گا۔ بوب آرم اس کے اگلے چھ مقابلوں کا اہتمام کرے گا۔ یقیناً وہ اس کا کیریئر بنانے کا منصوبہ بڑی احتیاط سے ترتیب دے گا۔ سپنکس کا اگلا مقابلہ کین نارٹن سے ہو گا۔ شاید اس کے بعد اُسے علی سے دوبارہ لڑنا پڑے۔ بہرحال سپنکس کو ابھی کوئی جلدی نہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ میں عالمی چیمپئن بن گیا ہوں، لوگ میرا احترام کرتے ہیں اور میرے لیے یہی کافی ہے۔
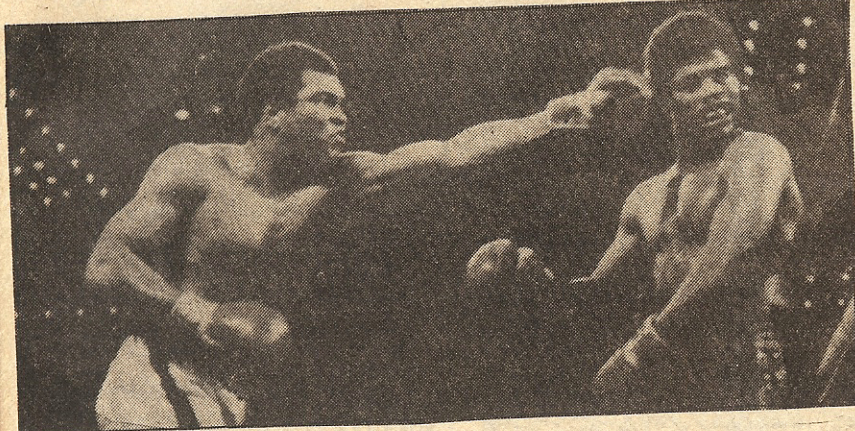
آئیے ذرا محمد علی کو بھی دیکھیں۔

اور یہ محمد علی ہے

۱۹۶۵ء میں اس نے فلائیڈ پیٹرسن کو شکست دے کر اپنا عالمی اعزاز برقرار رکھا۔ اس مقابلے میں بارھویں راؤنڈ تک علی نے پیٹرسن کی اس حد تک پٹائی کی کہ بڑے بڑے سنگدل بھی چیخ اُٹھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اسلام اور مسیحیت میں معرکہ آرائی ہو رہی ہے۔ اس مقابلے کے بعد امریکی حکومت نے علی کو حکم دیا کہ وہ فوج میں بھرتی ہو کر ویت نام جائے، لیکن اس نے انکار کر دیا اور کہا کہ میری ویت نامیوں سے کوئی مخاصمت نہیں۔ جب حکومت نے جبراً اپنا حکم منوانا چاہا تو علی نے عدالت میں اپیل کر دی اور عدالت میں بیان دیا کہ میں مسلمان ہوں لہٰذا اپنے ضمیر کے خلاف ویت نام کی جنگ میں حصہ نہیں لے سکتا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف اس کا عالمی اعزاز اس سے چھین لیا گیا، بلکہ اس کا باکسنگ لائسنس بھی منسوخ کر دیا گیا۔ علی نے عدالت میں اپیل کر دی۔ ساڑھے تین برس تک علی یہ مقدمات لڑتا رہا۔ بالآخر ۱۹۷۰ء میں

اسے مقابلوں کی اجازت مل گئی، چنانچہ اس نے جیری کوارے اور آسکر بونا وینا کو شکست دی اور ۸ مارچ ۱۹۷۱ء کو جو فریزر کو چیلنج کر دیا۔ اس مقابلے میں اسے شکست ہوئی، لیکن تین ماہ کے بعد ہی اس نے جو فریزر کو شکست دے کر بدلہ چکا دیا اور عالمی اعزاز دوبارہ حاصل کر لیا۔

اسی اثناء میں علی پھر امریکی حکومت کی انتقامی کارروائیوں کا ہدف بن گیا، چنانچہ پریشانی کے انہی ایام میں اس کا کین نارٹن سے مقابلہ ہوا جس میں اس کا جبڑا ٹوٹ گیا۔ نارٹن اس سے قبل فریزر کو ہرا چکا تھا، لیکن علی سے مقابلے کے بعد وہ جارج فورمین سے شکست کھا گیا۔ نائرے کے شہر کنشاسا میں علی نے جارج فورمین کو شکست دی اور عالمی اعزاز پھر اسے مل گیا۔

علی کے بارے میں تازہ ترین خبر یہ ہے کہ شکست کھانے کے باوجود بنگلہ دیش کے مسلمانوں نے اس کا عظیم الشان خیر مقدم کیا اور بنگلہ دیش کے صدر ضیاء الرحمن نے اسے اقوام متحدہ میں اپنا اعزازی کونسل مقرر کیا۔ پہلے خبریں آئی تھیں کہ علی بنگلہ دیش سے واپسی پر پاکستان آئے گا، لیکن بعد ازاں ایسا نہیں ہوا۔ بہر حال پاکستان ہی کے نہیں، پورے عالم اسلام کے مسلمان بالخصوص اور دنیا کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے اس کے مداحوں کو انتظار ہے کہ کب محمد علی اپنا اعزاز واپس لیتا ہے۔

---

۱۰ مارچ ۷۸ء کو پروموٹر بوب آرم نے اعلان کیا ہے کہ سابق عالمی چیمپئن محمد علی اور مکہ بازی کے عالمی چیمپئن سپنکس کے مابین اگلا مقابلہ ماریشس میں ہوگا۔

دونوں مکہ بازوں کے مابین مقابلے کا اعلان جوہانسبرگ اور نیویارک میں کیا گیا تھا، جس کے بعد سیاہ فام باشندوں کی تنظیم نے بوتسوانہ میں مقابلہ کروانے کے خلاف سخت احتجاج کیا تھا۔ نواوا اتھلیٹک نے گزشتہ روز سپنکس کو نوے دن کے لیے معطل کر دیا تھا، کیونکہ کمیشن کے مطابق محمد علی کے ساتھ مقابلے میں سپنکس کی پسلی پر چوٹ آگئی تھی۔ سپنکس نے کہا کہ وہ ستمبر میں محمد علی سے مقابلے سے قبل کسی اور مقابلے میں حصہ نہیں لے گا۔

سابق ہیوی ویٹ چیمپئن کن نارٹن نے کہا ہے کہ نئے ورلڈ ہیوی ویٹ چیمپئن لیون سپنکس نے مقابلہ کرنے پر جو رضامندی ظاہر کی ہے وہ باکسنگ پر ایک سیاہ دھبہ ہے اور انہوں نے کہا کہ مجھے سپنکس اور محمد علی کے درمیان اس نئے مقابلے کی خبر سن کر صدمہ ہوا ہے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ نارٹن نے، جولائی کو سپنکس سے مقابلہ کرنے پر رضامندی ظاہر کر دی تھی، لیکن بعد میں سپنکس اور علی کے درمیان دوبارہ مقابلے کے سلسلے میں ورلڈ باکسنگ ایسوسی ایشن نے منظوری دے دی۔

غیر ملکی اخبار کیا کہتے ہیں

پڑوس میں کیا ہو رہا ہے

نئے تجارتی معاہدے

اکانومسٹ سے

شہنشاہ ایران اور بھارت کے وزیر اعظم مسٹر مرارجی ڈیسائی کے درمیان گزشتہ ہفتے مال کے بدلے مال کی بنیاد پر تجارت اور قرضے کا ایک عظیم معاہدہ طے پایا جس کی مالیت ستر کروڑ ڈالر تک بڑھ سکتی ہے۔ ایران قرضے کی بنیاد پر بھارت کو تیل مہیا کرے گا تاکہ بھارت کے تین بڑے منصوبوں کے لیے سرمایہ مہیا کیا جا سکے، یہ تین بڑے منصوبے یہ ہیں۔ نہر راجھستان کا دوسرا مرحلہ۔ بھارت کے مشرقی ساحل پر پائے جانے والے باکسائٹ کے ذخائر استعمال کرنے کے لیے ایلومینیا پلانٹ کی تنصیب اور بنگلہ دیش کے مشرقی پہلو سے ملحقہ علاقے تری پورہ میں کاغذ کی مل کا قیام۔ یہ تینوں سکیمیں سرمائے کی کمی کے باعث برسوں تک کاغذی سطح پر رہیں۔ ایران سے ملنے والا یہ قرضہ مال کی صورت میں لوٹایا جائے گا۔ توقع ہے کہ بھارت ایران کو اس کی مجوزہ ایلومینیم کی صنعت کے لیے ایلومینیا، ایران کے ساحل سمندر پر نصب ہونے والی کاغذ کی فیکٹریوں کے لیے گودا، غلہ، گوشت، آلو اور کاغذ سپلائی کرے گا۔

ایران اور بھارت کے درمیان اقتصادی تعاون کا آغاز دو سال قبل اس وقت ہوا تھا جب دونوں ملکوں کے درمیان کدری مکھ کے خام لوہے کا سودا ہوا۔ ایران نے اس منصوبے میں ترسیٹھ کروڑ ڈالر کی سرمایہ کاری پر رضامندی کا اظہار کیا۔ یہ طے پایا تھا کہ بھارت رقم کی واپسی کے سلسلے میں ایران کی فولاد کی ملوں کے لیے خام لوہا مہیا کرے گا۔

اس مرتبہ بھی ادائیگی کی صورت حال یہی ہوگی۔ ایران راجھستان نہر کے لیے جو سرمایہ مہیا کرے گا اس کے عوض زرعی پیداوار مثلاً چینی بھارت سے حاصل کرے گا۔ اگر ایرانی قرضہ نقدی کی صورت میں واپس کیا گیا تو پھر ایران قرضوں کے علاوہ کچھ اضافی رقم بھارت کے ایلومینیا اور کاغذ سازی کے منصوبوں کے لیے بھی دے گا۔ ابھی ان دونوں منصوبوں کے بارے میں تفصیلات طے ہونی ہیں۔ آئندہ چند ماہ تک طرفین میں تفصیلی بات چیت ہوگی۔ توقع ہے کہ آئندہ سال تعمیراتی کام شروع ہو جائے گا۔

ترقی پذیر ممالک کے درمیان علاقائی تعاون کے مسئلے پر تجاویز تو بہت پیش کی گئی ہیں، مگر اتنی کامیاب نہیں ہوئیں، کیونکہ ترقی پذیر ہمسایہ ممالک کی معیشت اس ضمن میں کوئی مدد مہیا نہیں کر سکی۔ ایران خود علاقائی تعاون برائے ترقی کے ایک معاہدے میں ترکی اور پاکستان کا حلیف ہے، لیکن تینوں ملکوں کے ہمسایہ اور اسلامی ممالک ہونے کے باوجود یہ معاہدہ کوئی خاص کامیاب ثابت نہیں ہوا اور اس سے تینوں ملکوں کو کوئی قابل ذکر اقتصادی فائدہ نہیں پہنچا۔ اس تجربے سے شہنشاہ ایران کی خوش فہمیاں ختم ہوئیں تو انہوں نے اس علاقے میں کوئی اور اچھا ساتھی تلاش کرنے کے لیے گرد و پیش پر نظر دوڑائی اور بھارت سے تعلقات قائم کیے۔ ایران کی فولاد سازی اور ایلومینیم کی مجوزہ صنعتوں کے لیے بھارت کے پاس خام مال موجود ہے۔ علاوہ ازیں بھارت ایران کے انجینئرنگ کے منصوبوں کے لیے تکنیکی ماہر اور افرادی قوت بھی مہیا کر سکتا ہے اور مستقبل میں ایرانی تیل کے لیے ایک بڑی منڈی بھی بن سکتا ہے، لیکن دونوں ملکوں کے درمیان تجارت کے لیے خشکی کا کوئی براہ راست راستہ نہیں۔ بھارت کے وزیر خارجہ مسٹر باجپائی حال ہی میں پاکستان کے دورے پر آئے۔ تو پاکستان نے ان پر واضح کیا کہ اسے شہنشاہ کے ٹیرف فری زونوں یا فری ٹرانزٹ سکیموں میں کوئی دلچسپی نہیں۔

دونوں ملک اقتصادی تعاون کے لیے دیگر علاقے تلاش کرنے پر متفق ہوئے اور یہ طے پایا کہ بھارت ایران کے منصوبوں کے لیے فنی معلومات اور ساز و سامان مہیا کرے گا۔ اب دونوں ملک ریلوے لائنیں بچھانے، بجلی گھر قائم کرنے، نئے شہر بسانے، دیہات کو بجلی مہیا کرنے اور سامان بنانے والی دیگر مختلف صنعتیں قائم کرنے کے منصوبوں کا مطالعہ کریں گی — کیمیکلز کی صنعت میں ایران کی دلچسپی کے پیش نظر ایک خصوصی سب کمیٹی قائم کر دی گئی ہے۔ بھارت ایران کے پلاسٹک کے سامان اور کیمیاوی کھاد کے لیے مارکیٹ بھی مہیا کر سکتا ہے۔

ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

میانوالی کے نوابوں کے مظالم

میں محمد ضیاالحق صاحب کی توجہ کالاباغ ضلع میانوالی کے باسیوں پر مقامی جاگیرداروں کی طرف سے توڑے جانے والے مظالم اور مقامی و ضلعی انتظامیہ کی بے حسی کی طرف مبذول کروانا چاہتا ہوں جو انصاف کے طالب ہیں۔

(۱) مورخہ یکم مارچ ۱۹۷۷ء کو پاکستان قومی اتحاد کے ایک فعال کارکن حافظ عبدالرحیم پراچہ کو ریلوے اسٹیشن مسان (جاگیر نواب زادگان کالاباغ) پر پیل کار سے جبراً اغوا کرلیا گیا جو ابھی تک لاپتا ہے۔

عدالت عالیہ ہائی کورٹ لاہور کے حکم پر مورخہ ۶ر فروری کو ملزمان کے خلاف ابتدائی رپورٹ درج کی گئی، لیکن تمام مجرم اسی طرح آزاد پھر رہے ہیں اور وقوعہ کے گواہوں اور عبدالرحیم کے رشتہ داروں کو ہر طرح کے ہتھکنڈوں اور غنڈہ گردی کے ذریعے ہراساں کیا جارہا ہے۔

(۲) مورخہ ۲ر مارچ ۷۷ء کو کالاباغ کے بھرے بازار سے مسمیان خالد نیازی، طارق نیازی اور عبدالرحمان، پسران حاجی غلام رسول کو شدید زخمی کرکے اغوا کیا گیا، بعد میں ان کی دو دکانیں فینسی جنرل سٹور اور الفتح میڈیکوز، گھر کے زیورات، تمام نقد روپیہ اور بنک میں جمع شدہ سرمایہ اور تمام جائیداد بطور جرمانہ وصول کرکے ان کو رہا کیا گیا۔ (۳) ۲ر مارچ ہی کو کالاباغ کے مسمیان عبداللہ خان، حاجی محمد عظیم اور حافظ محمد یوسف کو پاکستان قومی اتحاد کی حمایت کرنے کے جرم میں اغوار کیا گیا اور ایک ماہ تک نجی جیلوں میں تشدد کرنے کے بعد بھاری جرمانہ وصول کرکے رہا کیا گیا۔

(۴) انہی دنوں نواب زادگان کی اپنی فورس کے سربراہ رمضان ماچھی کو نوابینِ کالاباغ نے اغوا کروایا جو ابھی تک عدم پتہ ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ آج روز تک کالاباغ کا واحد راشن ڈپو اور سیمنٹ کیرج کنٹریکٹ رمضان ماچھی کے نام چل رہا ہے اور شنید ہے کہ رمضان ماچھی کو نواب زادگان نے اپنے ایک مخالف کو قتل نہ کرنے کے جرم میں گول کروایا ہے۔ ایک افواہ یہ ہے کہ مذکورہ شخص کے لواحقین سے یہ بات لکھوائی ہے کہ مسمی پاگل تھا اور کہیں چلا گیا ہے۔

۵۔ مارچ ۷۷ء کے انتخابات کے دوران قاضی غلام مرتضےٰ کو غنڈوں کی مدد سے اغوا کرلیا گیا، اور روایت ہے کہ وہ ابھی تک نواب زادگان کی نجی جیل میں پابندِ سلاسل ہے۔ یاد رہے کہ ۷۱ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران قاضی غلام مرتضےٰ کے چھوٹے بھائی قاضی حبیب اللہ (قومی رضاکار) کو نوابین کالاباغ نے اپنے ایک پروردہ عبداللہ پراچہ کے ہاتھوں قتل کروادیا تھا اور دوسرے بھائی قاضی امیر عبداللہ کو شہر بدر کردیا گیا تھا۔

۶۔ جب ملک میں مارشل لار کا نفاذ ہوا تو میانوالی کے مارشل لار آفیسران نے نوابین کالاباغ کے جبری بیگار کیمپوں اور نجی جیلوں پر چھاپے مارے تو وہاں سے تقریباً ڈیڑھ سو کے لگ بھگ افراد برآمد ہوئے جن میں نابالغ بچے اور عورتیں بھی شامل تھے۔ تمام برآمد شدگان نے بیان کیا کہ ہمارے علاوہ روزانہ تقریباً کم و بیش چار ہزار نفوس سے جبری مشقت اور بیگار لی جاتی ہے (یہ خبر پاکستان کے کئی روزناموں میں بھی شائع ہوچکی ہے۔ جن میں روزنامہ جنگ راولپنڈی مورخہ ۱۴ر اگست ۱۹۷۷ء اور روزنامہ مشرق و امروز ۱۶ر اگست ۷۷ء شامل ہیں) لیکن تاحال ان نجی جیلوں اور بیگار کیمپوں کے مالک کھلے بندوں پھر رہے ہیں۔

۷۔ انہی چھاپوں کے دوران مارشل لار حکام کے ہاتھ نجی جیلوں سے کافی ناجائز اسلحہ لگا جس میں اسٹین گنیں تک شامل تھیں (خبر مطبوعہ روزنامہ جنگ راولپنڈی ۱۴ر اگست ۷۷ء) ابھی تک مجرموں کے خلاف تاحال کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔

۸۔ جمعیت علمار پاکستان کے صدر مولانا شاہ احمد نورانی، ایک ملاقات کے دوران چیف مارشل لار ایڈمنسٹریٹر جناب محمد ضیار الحق کو ریاست کالاباغ میں ہونے والے مظالم کی تفصیل سے آگاہ کرچکے ہیں۔ جناب جنرل صاحب نے ان سے وعدہ فرمایا تھا کہ وہ عنقریب نوابین کالاباغ کے مظالم کی تحقیقات کے لیے ایک کمیشن مقرر کریں گے" (خبر مطبوعہ روزنامہ نوائے وقت لاہور و جنگ راولپنڈی مورخہ ۱۵ر اکتوبر ۷۷ء) لیکن ابھی تک نوابین کالاباغ کے مظالم کی تحقیقات کیلیے کوئی کمیشن مقرر نہیں کیا گیا۔

درخواست ہے کہ اس سلسلے میں انصاف کیا جائے اور مظلومین کی حمایت کا فریضہ جو قانونی ہی نہیں، مذہبی ضرورت بھی ہے ادا کیا جاسکے۔

محمد مشتاق پراچہ

کمرہ نمبر ۲، راوی ہوٹل ۱۵۲۰ راوی روڈ لاہور

جواب دو

گزشتہ صحافت میں ڈاکٹر غفور قریشی صاحب کا ایک خط شائع ہوا۔ موصوف نے دل کی بھڑاس نکالنے کا عجیب طریقہ اختیار کیا اور قومی اتحاد کے لیڈروں پر خوب برسے۔

ان کا اسلام غالباً یہ ہے کہ تمام تر مکانات، بلڈنگیں، فلیٹ، دفاتر منہدم کردیے جائیں اور پورے ملک کو ریگستان بنا کر کھجوروں کے درخت لگائے جائیں اور اونٹ پالے جائیں، تمام فصلیں اگانا بند کردی جائیں، صرف جوار مکا کی کاشت کی جائے، تمام کپڑوں کی ملوں کو تالا ڈال کر کھڈی پر تہمد اور کرتوں کا کپڑا تیار کیا جائے۔ سائیکل، موٹر سائیکل، کاریں، ریل، بحری اور ہوائی جہاز ختم کرکے اونٹوں اور خچروں کو استعمال میں لایا جائے، کیونکہ بقول ان کے اسلام تو سادگی سکھاتا ہے۔

اگر قومی اتحاد کے لیڈر ڈاکٹر قریشی صاحب کا اسلام نہیں مانیں گے تو پھر محترم کوئی تعاون نہیں کریں گے، یوں لگتا ہے جیسے موصوف کی رائے میں شیعہ، سنی، بریلوی، دیوبندی متعدد فرقے قومی اتحاد ہی نے بنائے ہیں، ورنہ اس اتحاد سے پہلے یہاں کوئی فرقہ نہ تھا۔

قومی اتحاد کے لیڈر شلواریں، شیروانیاں، عمامے اور سوٹ چھوڑ کر تہمد اور جبے کرتے استعمال کیا کریں، کیونکہ بقول ان کے اسلام کی سادگی میں ان پوشاکوں کا کوئی جواز نہیں۔

اسلام اور سیاست کی تعلیم ڈاکٹر غفور قریشی صاحب سے حاصل کرنے کے بعد لب کشائی کی جرات کی جاسکتی ہے، امید ہے کہ مذہبی اور سیاسی پارٹیاں، لیڈران قوم، رحیم یار خاں کے اس مجدد سے فیض حاصل کرنے میں کوتاہی نہیں کریں گے۔ ذرا ہمیں بھی موصوف کا پتا دیجئے تاکہ ہم ان سے "حقیقی اسلام" کا درس لے سکیں۔

ڈاکٹر ایم۔ وائی۔ صدیقی ۱۵/۱۷ سی۔ ڈی۔ ایریا لیاقت آباد کراچی نمبر ۱۹

قاری عبد الخالق

مل مالکان... چھوٹے یونٹ
ایجنٹوں اور ورکروں کی زبانی مسائل

ٹیکسٹائل کی صنعت کو بچائیے

فیصل آباد کی سب سے بڑی صنعت ٹیکسٹائل ہے۔ ملوں اور مزدوروں کی نسبت ہی سے اس شہر کو ایشیاء کا مانچسٹر کہا جاتا ہے، لیکن آج کل اس کی یہ امتیازی صنعت بحران کے اس مقام پر ہے کہ اگر اسے سنبھالا نہ دیا گیا تو مکمل طور پر تباہ ہو جائے گی۔

فیصل آباد کی گوناں گوں مسائل سے دوچار اس صنعت کے بحران کی ابتدا کب اور کیسے شروع ہوئی؟ آج جب کہ ٹریڈ یونین سرگرمیوں پر پہلے کے مقابلے میں پابندیاں ہیں، چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی طرف سے بار بار سرمایہ داروں کو سرمائے کے تحفظ کا یقین دلایا جا چکا ہے مگر حالات نہ صرف جوں کے توں ہیں بلکہ پہلے کی نسبت دگرگوں دکھائی دیتے ہیں۔ ہم اس صنعت کے بحران کا جائزہ لینے کے لیے اس صنعت سے متعلق مختلف افراد سے ملے تاکہ پتا چل سکے کہ آخر نقص کہاں واقع ہے۔

اس سلسلے میں ہم نے بعض متعلقہ اصحاب سے رابطہ قائم کیا۔ ان کے خیالات ملاحظہ ہوں:

ملک مصطفےٰ احسن کوہ نور ملز کی انتظامیہ کے اہم فرد ہیں، اگر اس صنعت کو مختلف طبقات میں بانٹ دیا جائے تو ان کے نقطۂ نظر کو انتظامیہ کا نقطۂ نظر کہا جا سکتا ہے۔

انہوں نے اس بحران پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے پاس صرف تین ٹیکسٹائل ملیں تھیں۔ ملکی سرمایہ کاروں نے ذاتی کوششوں اور محنت سے اس صنعت کو فروغ دیا۔ حکومت کا تعاون بھی حاصل رہا، لیکن ۱۹۶۹ء تک ہماری صنعت اس قدر ترقی نہ کر پائی تھی جتنی کسی ترقی پذیر ملک کی صنعت ہوتی ہے۔ مزدور ترقی پذیر ممالک کے مزدور کی طرح نہ تو تربیت یافتہ تھا اور نہ اپنے حقوق و فرائض سے اس قدر آگاہ کہ ۱۹۶۹ء میں حکومت کی جانب سے انڈسٹریل ریلیشنز آرڈیننس نافذ کر دیا گیا۔

اس آرڈیننس کا یہ فائدہ تو ہوا کہ مزدور کو اپنے حقوق سے آگاہی ہوئی لیکن اس نے اپنے فرائض کو جاننے سے گریز کیا۔ یہ دور تھا جب ملک میں سیاسی بے چینی نے ہر کاروبار کو متاثر کر رکھا تھا۔ مزدور کام سے گریزاں تھا، لیکن مطالبات کے حصول میں کوشاں۔ پھر بھٹو دور آیا تو حکومت کی غلط معاشی پالیسی اس صنعت پر اثر انداز ہوئی۔ ۷۳-۱۹۷۲ء میں حکومت نے بغیر سوچے سمجھے ایکسپورٹ ڈیوٹی بڑھا دی۔ ڈیوٹی بڑھانے کا کارنامہ اُس وقت کے وزیر خزانہ ڈاکٹر مبشر حسن کا تھا۔ ٹیکسٹائل کی صنعت کے لیے یہ سب سے بڑا جھٹکا تھا۔ حکومت کو ملک کے بہی خواہوں نے بات سمجھانے کی کوشش کی، لیکن ان کی کسی بات کو نہ مانا گیا۔ یہاں تک کہ جاپان کے وفد نے پاکستان کا دورہ کیا تو ڈاکٹر مبشر حسن نے تین دن تک وفد کو ملاقات کا وقت ہی نہ دیا۔ ملاقات ہوئی بھی تو جاپانی وفد کو ناکام لوٹنا پڑا۔ وفد کا کہنا تھا کہ اگر پاکستان ایکسپورٹ ڈیوٹی کم کرنے پر رضامند نہیں تو اسے کم از کم پہلے کئے جانے والے سودوں پر لاگو نہ ہونا چاہیے، لیکن ان کی بات نہ مانی گئی۔

یہ ناکامی جاپانی وفد کی ناکامی نہ تھی، بلکہ پاکستان کی ناکامی تھی کیونکہ ڈاکٹر مبشر سے وفد کے مذاکرات ناکام ہونے کے نتیجہ میں جاپان نے تمام سودے منسوخ کر دیئے اور خود دھاگا بنانا شروع کر دیا۔ یہی کچھ دیگر غیر ممالک سے کئے گئے سودوں کا حال ہوا۔ یا تو ان ممالک نے مال خود تیار کرنا شروع کر دیا یا پاکستان کی بجائے دوسرے ملک سے سودے کر لیے۔

ملکی صنعت ان حالات سے دوچار بیرونِ ملک مقابلے میں لگی ہوئی تھی کہ مزدور کے اوقات کار میں کمی کا اعلان کر دیا گیا جس کا اثر پیداوار پر ہوا۔

اب صورت حال یہ تھی کہ کپڑے کی برآمد حکومت کے غلط فیصلوں سے بڑی طرح متاثر تھی اور جو مال تیار ہو رہا تھا اس کی کوئی مارکیٹ نہ تھی۔ صنعت کو سنبھالا دینے کے لیے مالکان نے حکومت سے اپیل کی کہ وہ ورکرز کو معاوضہ پہلا ہی دیں گے، لیکن انہیں دو شفٹیں چلانے کی اجازت دی جائے جبکہ اس سے قبل تین شفٹیں کام کر رہی تھیں، لیکن اس مطالبے کو پذیرائی میسر نہ آئی، بلکہ ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ حکومت نے وہ مزدور جو پہلے ہی بے قابو ہو رہا تھا، اسے مزید سہولتیں دینے کا اعلان کر دیا اور اس طرح مالک اور مزدور کی جنگ کو ہوا دے کر حالات کو مزید خراب کر دیا گیا۔ کارخانہ دار دہری مصیبت کا شکار ہو گیا۔ ایک طرف کساد بازاری اور دوسری طرف مزدور کے بڑھتے ہوئے مطالبات، چنانچہ صنعت کے حالات خراب سے خراب تر ہوتے چلے گئے اور آج جو حالات ہیں اگر اس صنعت کو سنبھالا نہ دیا گیا تو بہت ممکن ہے کہ اس کا پہیہ جام ہو کر رہ جائے۔

محمد زمان خان نیازی تھوک فروش ہیں۔ ملوں سے تیار شدہ مال کی گانٹھیں خرید کر اور پاور لومز کا کورا کپڑا لے کر اسے پرنٹ کے کارخانے سے تیار کرواتے ہیں اور پرچون فروش دکانداروں کے پاس فروخت کرتے ہیں۔

انہوں نے بتایا کہ ٹیکسٹائل کے بحران کا آغاز ۱۹۷۲ء سے ہوا۔ وہ اس طرح کہ حکومت نے اقتصادی بحران کے فوری حل کے لیے نتائج و عواقب پر غور کئے بغیر ملکی روپیہ کی قیمت میں بے تحاشا کمی کر دی، لیکن یہ کوئی حل نہ تھا۔ حکومت کا مقصد صرف ناقدوں کا منہ بند کرنا تھا، چنانچہ یہی ہوا۔ وقتی طور پر عام آدمی کا تبصرہ رُک گیا۔ بیرونی ممالک سے تاجروں نے مال کے آرڈر دینے شروع کر دیے اور کاروبار خوب چمکا۔ پاور لومز کے مالکان نے خوب کمایا، جس کی دو لومیں تھیں، اس نے ۲۰ تک لومیں نصب کر لیں، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ ہوا کہ حکومت کے محبوب اجارہ دار تاجروں نے اپنے سیاسی اثر و رسوخ سے پاکستان ٹریڈنگ کارپوریشن سے کپڑے کی برآمدات کے حقوق واپس لیکر خود برآمد شروع کر دی، لیکن مال کی تیاری میں [illegible] دیانت کا وہ معیار قائم نہ رکھا جس کے سبب بیرونی ممالک میں کپڑے کی مانگ کم ہونی شروع ہو گئی۔ ہم عالمی منڈی میں دوسرے ممالک کا مقابلہ نہ کر سکے اور ہماری تجارت سکڑتی چلی گئی۔ مال کی کھپت رُک گئی تو تیار شدہ مال جمع ہونے کے سبب کساد بازاری نے جنم لیا۔

زمان خان نیازی صاحب نے بتایا کہ ہماری ٹیکسٹائل کی صنعت کے بحران کا سب سے بڑا سبب غلط درآمد و برآمد کی پالیسی ہے۔ حکومت نے ملکی کپاس کی اہمیت کو نظر انداز کرتے ہوئے غیر ملکی دھاگا، پولیسٹر، ٹیٹرون وغیرہ کی درآمد شروع کر دی۔ یہ کپڑا ملک میں مقبول ہوا تو سوتی کپڑے کی صنعت متاثر ہوئی۔ اگر سوتی کپڑے کی برآمد کا بندوبست ہوتا تو سلکی صنعت، سوتی صنعت کی جگہ نہیں بلکہ اس پر اضافہ ہوتی اور کاروبار میں اضافہ ہوتا مگر ہوا یہ کہ

مبشر حسن صاحب نے ایکسپورٹ ڈیوٹی بڑھا کر اس کا رہا سہا بیڑا غرق کر دیا۔ غیر ممالک سے تجارتی سودے منسوخ ہو گئے اور ان ممالک نے یا تو خود اس صنعت میں ترقی کی یا دیگر ممالک سے سودے کر لیے جو کہ کم از کم تین سال یا چار سال کے لیے ہوتے ہیں۔

سوتی صنعت کے بعد سلکی صنعت بھی بحران کا شکار ہو گئی جس کی وجہ سے اندرون ملک ٹیٹرون اور پولیسٹر کے عام استعمال میں اضافہ ہوا۔ یہ کپڑا، سوتی کپڑے کی نسبت زیادہ دیرپا ہے، جو شخص سال میں دو سوتی قمیصیں استعمال کرتا ہے، وہ ٹیٹرون کی ایک قمیص سے سال نکال لیتا ہے، چنانچہ کپڑے کی عام خریداری کم ہو گئی، لیکن مال اسی قدر تیار ہوتا ہے۔ بیرون ملک برآمد کا بندوبست نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ سلکی صنعت بھی جام ہوتی جا رہی ہے۔ حکومت کپڑے کی بجائے کپاس برآمد کرتی ہے جو ملکی صنعت سے صریحاً ناانصافی ہے۔ کوئی ترقی پذیر یا ترقی یافتہ ملک اپنے ہاں موجود خام مال کو برآمد کرنے کی بجائے اس سے تیار شدہ مال سے زرمبادلہ کماتا ہے۔ ان تمام عوامل کے کام کرنے کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے کہ ٹیکسٹائل ملیں جزوی طور پر اور پاور لومز تقریباً مجموعی طور پر اس وقت بند ہو چکی ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ہماری صنعت کے بحران میں ناجائز منافع خوری نے کام کیا ہے۔ ہر شخص کم سے کم سرمایہ لگا کر زیادہ سے زیادہ منافع کمانا چاہتا ہے۔ ناجائز منافع خوری کی اس لعنت میں خوردہ فروش سے لے کر کارخانہ دار تک ملوث ہیں۔"

میاں ہدایت علی اختر پاور لومز کا کام کرتے ہیں۔ پڑھے لکھے اور تجربہ کار ہیں۔ انہوں نے ٹیکسٹائل کے بحران پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ جب ملک کی سپننگ ملز نے سوت بنانا شروع کر دیا اور اس کی برآمد کی طرف توجہ دینی شروع کی تو بیس پونڈ سے سو پونڈ تک کا سوت برآمد کے قابل تھا، چنانچہ اس کی کوالٹی پر توجہ دی گئی تو ۸۰ فیصد تک سوت کوالٹی کے لحاظ سے برآمد کرنے کے قابل ہو گیا۔ ہمارے سوت کو عالمی منڈی میں مقبولیت ہوئی۔ ہانگ کانگ اور جاپان جیسے ملک ہمارے سوت کے گاہک تھے۔

خام کپڑے کا دور چلا تو گھریلو صنعت کے طور پر پاور لومز نے رواج پایا۔ مقامی پاور لومز بنانے والوں نے ملکی ضرورت کو پورا کیا۔ پاور لومز کے پھیلاؤ اور اس کی ضرورت کو پورا کرنے میں حکومت کی کسی منصوبہ بندی کو دخل حاصل نہیں۔ صورت حال یہ ہے کہ کل کپڑے کی پیداوار کا ۸۰ فیصد کے قریب پاور لومز مہیا کرتی ہیں۔ برآمد کے لیے ملکی صنعت کے کاریگروں نے کوالٹی کنٹرول کر کے عالمی منڈی میں اپنا لوہا منوا لیا۔ بھارت کے مقابلے میں عالمی منڈی میں پاکستان آگے تھا کہ ۱۹۶۸ء میں سیاسی بے اطمینانی اور گڑبڑ شروع ہو گئی۔ ایک سیاسی جماعت نے مزدوروں کو سیاسی میدان میں استعمال کیا۔ گھیراؤ جلاؤ کے واقعات رونما ہوئے۔ اس وقت کے بند ہونے والے کارخانوں میں سے بعض ابھی تک بند پڑے ہیں۔ اس طرح پیداوار متاثر ہوئی اور دوسرے مشرقی پاکستان میں حالات کے خراب ہو جانے سے وہاں مال جانا بند ہو گیا، تقریباً ایک سال تک یہ حالات رہے۔ کپڑے کی کھپت کا وسیع علاقہ ختم ہونے سے طویل مندا ہوا۔ مشرقی پاکستان میں پھیلی ہوئی کرنسی مغربی پاکستان میں آ گئی۔ ملک آدھا رہ گیا تھا اور پورے ملک کی کرنسی کا دباؤ برداشت نہ کر سکا جس کے نتیجے میں قیمتیں چڑھ گئیں۔ ہر طرف مہنگائی کی لہر ابھری۔ کپڑے کی صنعت کی قیمتیں گریں اور کارکن بدلی کا شکار ہو گئے۔ ایک طرف مندا اور دوسری طرف مزدور کا اجرت زیادہ طلب کرنا، اس کا صنعت پر بہت برا اثر پڑا۔ کرنسی کی قیمت ۱۰ روپے ڈالر کر دی گئی۔ عالمی منڈی میں مقابلہ مشکل ہو گیا جبکہ کوالٹی پہلے ہی خراب ہو چکی تھی۔ صنعت کا مسلسل کئی برسوں سے ان حالات کا سامنا کرنے سے جو حال ہوا وہ آج سب کے سامنے ہے۔ موجودہ ریٹ پر کپاس خرید کر اس سے کپڑا تیار کرنے کے بعد ملکی تاجر عالمی منڈی میں مقابلے کے قابل نہیں۔ حکومت ساڑھے سات فیصد لینڈ لارڈز کے مفادات کا تحفظ ترک کر کے ساڑھے بانوے فیصد صارفین کی نمائندگی کرے اور اس کے لئے منصوبہ بندی کرے تو مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

خادم حسین چیمہ بروکر ہیں۔ ان کا واسطہ خرید و فروخت کرنے والے دونوں قسم کے افراد سے ہوتا ہے۔ انہوں نے ٹیکسٹائل کے بحران پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ہر ملک صنعت کی آخری شکل برآمد کرتا ہے، لیکن ہمارے ہاں بڑی ملوں اور افسروں کی ملی بھگت سے دھاگا برآمد کیا جاتا ہے اور اس وجہ سے اندرون ملک دھاگا مہنگا ہے۔ جس وقت پاور لومز اور چھوٹی مل کا مالک عالمی منڈی میں خاص طور پر بھارت کے مقابلہ میں کپڑا نہیں بیچ سکتا تو پریشان ہو جاتا ہے، چنانچہ اس صورت حال کی وجہ سے پاور لومز کا کاریگر اور مالک دونوں پریشان ہیں کیونکہ مالک جس ریٹ پر کپڑا گھر تیار کرتا ہے، مارکیٹ ریٹ اس سے آٹھ آنے یا دس آنے کم ہے۔ ہمارے ملک میں خاص طور پر فیصل آباد میں تیار ہونے والا کپڑا ضروریات سے ۶۰ فیصد زائد ہوتا ہے، لیکن اس کی برآمد کا کوئی انتظام نہیں اور کپڑے کی صنعت بحران کا شکار ہے۔

کپڑے کی صنعت کے بڑے اجارہ دار نمونے کے مطابق مال تیار نہیں کرتے۔ منافع کی شرح زیادہ رکھتے ہیں۔ درآمد و برآمد پر لائسنس دار کی اجارہ داری ہے۔ اگر کپڑا بیرون ملک برآمد کرنے کی عام اجازت ہو تو مقابلہ کے سبب جہاں ملکی برآمد میں اضافہ ہوگا وہاں مصنوعات کی کوالٹی بھی بہتر ہو جائے گی، لیکن اس سلسلے میں کپڑے کے اجارہ دار اور بیوروکریسی آڑے آتی ہے۔

حکومت کی طرف سے ریشمی دھاگے کے لائسنس چھوٹی پاور لومز والوں کو ملتے ہیں۔ یہ لوگ اسے آگے بیچ دیتے ہیں۔ جو پارٹیاں ان سے لائسنس لے کر دھاگا درآمد کرتی ہیں، انہیں دھاگے کے ریٹ اور لائسنس کی خرید پر ادا کی جانے والی قیمت بھی ڈالنی ہوتی ہے، چنانچہ ڈیوٹی وغیرہ اور دیگر اخراجات اٹھ جانے کی وجہ سے یہ دھاگا مہنگا ہو جاتا ہے۔ ادھر ملکی ملیں اپنے تیار شدہ دھاگے کے ریٹ بھی بیرونی دھاگے کے مطابق بڑھا دیتی ہیں۔ اگر باہر سے دھاگا سستا آئے تو ملکی ملیں بھی اپنے دھاگے کی قیمت میں اضافہ نہ کر پائیں جبکہ ان کی کوالٹی بھی بیرونی دھاگے کے مقابلے میں ہلکی ہوتی ہے، لیکن بغیر لائسنس کے پاور لومز کا کام کرنے والے یہ دھاگا لینے پر مجبور ہیں۔ جس قسم کے کپڑے کا موسم شروع ہوتا ہے، اس کی ضرورت کے دھاگے کا ریٹ اجارہ داری کے سبب بڑھا دیا جاتا ہے۔

خادم حسین چیمہ نے کہا کہ تجارتی پالیسی اور اقتصادی پالیسی طویل المیعاد اور مستحکم ہونی چاہیے۔ کوئٹہ اور سرحد کے راستے مال سمگل ہوتا ہے اگر حکومت دونوں سرحدوں پر کھلی تجارت کی اجازت دے تو کپڑے کی تجارت بڑھے اور سمگلنگ رک جائے۔ انہوں نے بتایا کہ یہ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جب کپڑے کی سمگلنگ زیادہ ہوتی ہے تو ملکی صنعت تیز ہو جاتی ہے۔ جب بارڈر بند ہوتا ہے تو بحران پیدا ہو جاتا ہے۔

ٹیکسٹائل صنعت کے مختلف پہلوؤں سے تعلق رکھنے والے ان افراد کے خیالات قابل قدر ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ حکومت اس سلسلے میں کوئی ایسی کانفرنس منعقد کرائے جس میں ان سبھی گوشوں سے تعلق رکھنے والے اصحاب کو اپنے مسائل پیش کرنے کا حق دیا جائے اور سب لوگ مل جل کر ایسے نتائج تک پہنچیں جن سے ہماری صنعت کو فائدہ ہو۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مزدور کا مفاد اور محنت کش کی ضروریات سب سے مقدم ہیں، لیکن انتظام اس طرح کا ہونا چاہیے کہ پیداوار بڑھے اور محنت کش کو بھی اس کے منافع کا حصہ ملے، لیکن مالک اور دیگر متعلقہ افراد بھی کساد بازاری کا شکار نہ ہوں۔

بانئ پاکستان کی زندگی سے

زندگی کھانے اور سونے کیلئے نہیں

قائداعظم دوسروں سے کام لینے میں سخت گیر واقع ہوئے تھے، لیکن اپنے آپ کو بھی اتنا ہی رگیدتے تھے جتنا کہ دوسروں کو۔ ان کا موقف تھا کہ جو کچھ کرنا ہے جلدی کرلو، کیونکہ پھر وقت نہ ملے گا۔ کھانا، آرام اور نیند سب کو ان کی زندگی میں اپنی باری کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ کام کو آگے بڑھانے کا جذبہ یا جوش انہیں ٹھیک وقت پر کھانے یا آرام کرنے سے روکتا تھا، اسی عادت نے لبعد کے برسوں میں ان کی جسمانی قوت کو مضمحل کرنا شروع کر دیا۔ اور وہ دق کا شکار ہو گئے، جس نے انہیں قبر تک پہنچا دیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ملازم انہیں دوپہر یا رات کے کھانے کے لیے بلاتے یا آرام کے لیے پوچھتے اور وہ کسی کام میں مصروف ہوتے تو ان کی طرف توجہ ہی نہ دیتے۔ اگر فاطمہ جناح خود آ کر دریافت کرتیں تو کہتے، بس چند منٹ اور، یا تم شروع کر دو، میں بعد میں کھالوں گا

کام کی لگن میں انہیں کھانے پینے اور سونے غرض کسی ضرورت کا دھیان نہ ہوتا تھا۔ (اصفہانی)

ناپ تول میں سولہ آنے کھرے

یہ اپریل ۴۴ء کا ذکر ہے۔ بمبئی کلاتھ ہاؤس کے مالک سیٹھ محمد صدیق نے حضرت قائداعظم سے درخواست کی کہ آپ لاہور آئیں تو ہماری دکان ضرور دیکھیں۔

قائداعظم کو یہ سن کر بہت خوشی ہوئی کہ لاہور میں مسلمانوں کی ایک اچھی دکان ہے۔ انہوں نے وعدہ کر لیا۔

جب وہ دکان پر آئے تو چند کپڑے پسند کیے۔ مگر بل کے لیے اصرار کیا۔ ہم نے بہت کہا کہ یہ تحفہ ہیں مگر وہ نہ مانے۔ منیجر بل بنا کر لایا تو وہ بہت رعایتی تھا، مقصد محض ان کی تسلی تھی، مگر انہوں نے بل دیکھ کر کہا "یہ مناسب نہیں، تم نے قیمتیں جان بوجھ کر کم لگائی ہیں"۔

میں نے کہا، شاید منیجر صاحب نے آپ سے رعایت کی ہے۔ فرمانے لگے کہ یہ رعایت نہیں، اور رعایت ہی بات ہے، تم جاؤ اور بل درست کرواؤ۔

میں نے بل درست کروا دیا۔ بعد ازاں بٹن جو انہوں نے شیروانی کے لیے پسند کیے تھے، ان کا بل پیش کیا گیا جو صرف دس روپے تھے، آپ نے اس بل کو بھی غور سے دیکھا، پھر بولے:

"بھئی واہ تم نے بل پورا بنایا ہے، حالانکہ ایک سیٹ میں تین بٹن کم ہیں، اسے کم کرداؤ"۔

میں حیران رہ گیا، واقعی غلطی دکاندار کی تھی۔ ایک سیٹ میں تین بٹن کم تھے اور اسے بل کم بنانا چاہیے تھا۔ بل درست کرایا گیا تو انہوں نے منظور کیا۔

یہ خوبی میں نے انہی کی ذات میں دیکھی کہ سینکڑوں روپے کی رعایت کو قبول نہ کیا، لیکن جب بل کی رقم آٹھ آنے زیادہ تھی، اسے درست کرایا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ ناپ تول میں سولہ آنے کھرے تھے اور زندگی کے سبھی معاملات میں ان کا یہی طرز عمل تھا۔ (ولی بھائی)

عوام، بھیڑوں کا گلہ نہیں

نظام حیدر آباد کے نمائندے کی حیثیت سے میں حضرت قائداعظم کے سامنے بیٹھا تھا۔ انہوں نے کہا:

"بعض لوگ مجھے مشورہ دیتے ہیں کہ حیدر آباد کا کشمیر سے تبادلہ کر لوں۔ تمہاری اس بارے میں کیا رائے ہے؟"

میں نے جواب دینے میں توقف کیا، کیونکہ سوال ہی ایسا تھا۔ اس پر قائداعظم نے سیدھے ہاتھ کی انگشتِ شہادت اٹھا کر خود ہی جواب دیا۔

"کیا تم بھیڑوں کا گلہ ہو جو میں ایک گلے کا تبادلہ دوسرے گلے سے کر لوں۔ یہ بتانا تمہارا کام ہے کہ تم اس قسم کا تبادلہ چاہتے ہو یا نہیں۔ اگر تم لوگ نہیں چاہتے تو دنیا کی کوئی طاقت تمہیں مجبور نہیں کر سکتی اور جہاں تک میرا تعلق ہے، تمہیں مجبور کرنا تو درکنار، میں تمہیں دوستانہ ترغیب دینے کو بھی تیار نہیں۔" (مشتاق احمد خاں)

منصب کی عظمت کا خیال

بیماری کے آخری دنوں میں ہمیں کراچی میں نواب بہاولپور کے مکان کی ضرورت پڑی، جو ملیر میں تھا۔ قائدِ اعظم کوئٹہ میں صاحبِ فراش تھے۔ ہم نے اجازت طلب کی کہ وہ فرمائیں تو ہم نواب بہاولپور کو جو لندن میں ہیں تار دے کر اجازت حاصل کر لیں۔ قائدِ اعظم نے پوری بات سن کر جواب دیا:

"آپ نے سنا ہوگا کہ پہلے زمانے میں جب کوئی وکیل، ہائی کورٹ کا جج بن جاتا تو کلبوں اور نجی محفلوں میں جانا ترک کر دیتا تھا کہ اس کی غیر جانبداری پر اثر نہ پڑے، چنانچہ میں سمجھتا ہوں کہ مجھے گورنر جنرل کے اعلیٰ منصب کا خیال رکھنا چاہیے۔ یہ درست ہے کہ اس وقت ہم ضرورت مند ہیں، لیکن میں اپنی ذات کی خاطر اس عظیم منصب کی عظمت اور غیر جانبداری کو خاک میں نہیں ملا سکتا، لہٰذا تمہیں تار دینے کی اجازت نہیں"۔ کرنل الٰہی بخش

انسان یا چٹان

قائدِ اعظم چھریرے بدن کے مالک تھے اور لگتا تھا کہ اگر کوئی زور سے چھو دے تو شاید اپنا جسمانی توازن کھو دیں، لیکن یہ اندازہ درست نہ تھا۔ وہ اگرچہ بظاہر نحیف نظر آتے تھے، لیکن ستر برس کی عمر میں بھی انہوں نے اپنے قتل کے لیے آنے والے ایک نوجوان کا ہاتھ اتنی مضبوطی سے پکڑا کہ اسے دن میں تارے نظر آنے لگے۔

اس نوجوان کا نام رفیق جابر تھا اور یہ جولائی ۴۳ء میں خنجر لے کر انہیں قتل کرنے آیا۔ قائدِ اعظم نے اپنا دبلا پتلا ہاتھ بڑھا کر قاتل کی کلائی کو بڑی مضبوطی سے پکڑا اور قوت سے اسے نیچے دبائے رکھا، یہاں تک کہ اس کی آواز سن کر ساتھ والے کمرے سے پرائیویٹ سیکرٹری مسٹر سید آن پہنچے اور مجرم کو گرفتار کرا دیا۔ اس تمام عرصے میں قائدِ اعظم کے چہرے پر کمال سکون و اطمینان رہا اور انہوں نے ایک لمحے کے لیے بھی کسی خوف یا پریشانی کا اظہار نہ کیا۔ (اصفہانی)

سرکاری ملازموں کے۔۔

ایک بار زیارت میں قائدِ اعظم بیماری کی حالت سے ذرا سنبھلے تو ان مسلمانوں کے بارے میں گفتگو شروع کر دی، جنہوں نے جنگ کے زمانے میں انگریزی ملازمتیں شروع کیں اور اپنے افسروں کو خوش کرنے کے لیے شراب پینے لگے۔ قائداعظم بولے:

"یہ انسانی کردار کی انتہائی پستی ہے کہ وہ ایسی رکیک حرکتیں کر کے دوسروں کی خوشنودی حاصل کرے۔ لوگوں کو چاہیے کہ جو کام ان کے سپرد کیا جائے، خواہ وہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو، وہ قابلیت کے ساتھ انجام دیں۔ دیر یا سویر ان کی محنت کا ثمر انہیں ضرور ملے گا، کیونکہ کوئی آقا یا حکومت کسی مستحق ملازم کو ترقی سے نہیں روک سکتی۔ اگر سرکاری ملازم اونچے مرتبے یا ترقی کے لیے سفارشوں اور سازشوں سے کام لینا چھوڑ دیں تو ملک سے دوست نوازی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ (فرخ امین)

ہفت روزہ صحافت ○ ۳۸۔ ملتان روڈ۔ لاہور ○

رجسٹرڈ ایل نمبر: ۸۱۰۳
فون نمبر: ۴۱۶۰۷۸